جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ھیں۔

نام کتاب	اطاعت
تقاریر	سید العلماء علامہ علی نقیؒ
تالیف	عابد عسکری فاضلِ قم
ترتیب نو	قلب علی سیال
کمپوزنگ	الحمد گرافکس لاہور (فضل عباس سیال)
ناشر	معراج کمپنی لاہور
تاریخ اشاعت	2014ء
طبع	اوّل
قیمت	

ملنے کا پتہ

معراج کمپنی

LG-3 بیسمنٹ میاں مارکیٹ غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور۔

فون: 0321-4971214/0423-7361214

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرضِ ناشر

مکرمی ومحترمی_____________ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

''معراج کمپنی'' دینی کتب کی اشاعت کے حوالہ سے ایک جانا پہچانا ادارہ ہے۔ادارہ عرصہ دراز سے دینی کتب کی اشاعت میں اپنی خدمات انجام دے رہا ہے۔ادارے کا مطمع نظر عوام تک بہتر اور سستے ترین انداز میں کتب کی ترسیل ہے۔اللہ تعالیٰ ادارہ ھذا کو اس عظیم کام کی انجام دہی کیلئے بھرپور وسائل عطا فرمائے۔

زیرِ نظر کتاب ''اطاعت'' سید العلماء علامہ علی نقیؒ کی تقریروں کا عظیم مجموعہ ہے۔ جسے مولانا عابد عسکری نے اپنے زورِ قلم سے مزید سنوارا ہے۔ ہمارے پیارے رسولؐ کی سیرت کے کتنے گوشے ہیں آپ پہلے ایک منبر پر تشریف لے جاتے آج ایک نیا منبر ہے جو ایک کھلے میدان میں رکھا گیا ہے پہلے منبر پر اکیلے تشریف لے جاتے تھے آج کسی کو منبر پر اپنے پاس بٹھالیا۔اس وقت آپ نے فرمایا لوگو سنو اور غور سے سنو میں جس کا مولاؑ ہوں علیؑ اُس اُس کے مولاؑ ہیں۔قارئین حضرات اس سے بھرپور استفادہ کریں۔

اُمید ہے آپ ادارہ ہذا کی اس کوشش کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے اور قرآن وعترت کی نصرت اور سید العلماء کی قدردانی کا حق ادا کرنے میں بھی کوشاں رہیں گے۔۔۔۔۔۔۔والسلام

معراج کمپنی لاہور

فہرست مضامین

پہلی مجلس	6
اولی الامر کون؟	7
مصائب	30
دوسری مجلس	33
اطاعت خداوندی	34
مصائب	54

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْن وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْن اَبِی الْقَاسِمِ مُحَمَّدْ خَاتَمِ النَّبِیِّیْن وَاٰلِهِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاهِرِیْنَ الْمَعْصُوْمِیْن اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللّٰهُ سُبْحَانَهٗ فِیْ کِتَابِ الْمُبِیْن وَهُوَ اَصْدَقُ الصَّادِقِیْن

پہلی مجلس

- میں کہتا ہوں اللہ اور رسول کے بیچ میں ''اَطِیْعُوا'' آیا مگر رسول اوراولی الامر کے بیچ میں اللہ کا لفظ بھی گوارا نہیں تھا۔
- جب ان کی اطاعت ہو جائے تو پھر سمجھ لو کہ اللہ کی اطاعت ہوگئی یعنی مرضی الٰہی میں تمہاری نگاہ سند نہیں ہے رسولؐ کے اقوال سند ہیں۔
- اب ایک پوری سیرت کی کتاب میں سمیٹ کر چندلفظوں میں بیان کروں خالق نے ان سب کو سمیٹ کر ایک سند دی کہ اے پیغمبرؐ آپ عظیم اخلاق کے درجہ پر فائز ہیں یہ خدائے اکبر دنیائے سیرت میں ان کے کردار کو عظیم کہہ رہا ہے۔
- اولی الامر کے معنی میں نے کہے تھے صاحبان امر ہم ہر دور کے اس فرد کو صاحب الامر کہتے ہیں۔
- میں کہتا ہوں اسے گریباں میں منہ ڈال کر دیکھئے کہ گیارہ کے ساتھ آپ نے کیا سلوک کیا؟ کیا جواب پوچھ رہے ہیں کہ بارہویں کو غائب کیوں کیا۔

اولی الامر کون؟

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ ۚ

اے ایمان لانے والو! فرماں برداری کرو اللہ کی اور فرماں برداری کرو رسولؐ کی اور ان کی جو تم میں فرماں روائی کے حق دار ہیں۔

اس آیت کو جو عنوانِ کلام ہے، میرا موضوعِ کلام قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد ہو رہا ہے کہ اے صاحبانِ ایمان! اللہ کی اطاعت کرو اور ان حقدارانِ حکمرانی کی جو تم ہی میں سے ہیں۔ تمام اہلِ ایمان سے خطاب ہے تین اطاعتوں کا مگر قابل غور یہ بات ہے کہ اطاعت کے حکم تین ہیں اور لفظ ''اَطِیۡعُوۡا'' بس دو دفعہ ہے۔ یعنی سمجھ میں آتا ہے کہ یا یہ ہوتا کہ ایک ''اَطِیۡعُوۡا'' ہوتا اور اس کے تحت وہ تمام ہستیاں جن کی اطاعت فرض ہے، درج ہو جاتیں کیونکہ حرفِ عطف اس لئے ہوتا ہے کہ وہ ایک حکم میں کئی کو شریک کر دے۔ آپ کسی سے کہیں کہ کل فلاں وقت آپ اور وہ اور وہ میرے ہاں آئیں۔ تو اب بس۔ میرے ہاں آئیں۔ ایک دفعہ کہنا کافی ہے اور جو

جوآئیں،ان کا نام ایک ساتھ حرفِ عطف کے ساتھ کہ آپ اور وہ اور وہ یہاں آئیں۔ایک طریقہ تو یہ ہے۔ایک طریقہ بات پر زور دینے کا وہ ہے کہ جن جن کا نام لینا ہے،ان میں سے ہر ایک کے ساتھ حکم بھی دہرا دیا جائے۔

تو اب غور کیجئے کہ جن کی اطاعت کا پیغام دیا جارہا ہے،وہ ہیں تین۔ اللہ، رسول اور اولی الامر۔اور ''اَطِیۡعُوۡا'' تین لفظوں کے ساتھ نہیں آتا۔ ورنہ ہوتا:

اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوۡلَ وَ اُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ ۚ

''اللہ کی اطاعت کرواور رسول کی اطاعت کرواور صاحبانِ امر کی اطاعت کرو جو تم ہی میں سے ہوں''۔

یا ہر ایک کے ساتھ ''اَطِیۡعُوا'' ہوتا ایک، یعنی تینوں کے ساتھ تین ''اَطِیۡعُوۡا'' ہوتے۔مگر قرآن مجید اس طریقہ کو بھی چھوڑتا ہے،اُس طریقہ کو بھی چھوڑتا ہے۔نہ یہ کرتا ہے کہ ایک ''اَطِیۡعُوۡا'' کہے کہ اطاعت کرو اور سب کا نام لے کر دے اور نہ یہ کرتا ہے کہ تینوں کے ساتھ ''اَطِیۡعُوۡا'' کہے بلکہ ایک درمیانی راستہ اختیار کرتا ہے کہ اللہ کے ساتھ تو ایک ''اَطِیۡعُوۡا'' الگ اور رسول اور اولی الامر کے ساتھ ایک ''اَطِیۡعُوۡا'' الگ۔اس میں کوئی حکمتِ کلام ہونا چاہئے۔بلاغت کلامِ الٰہی ایک ایسا اسلوب اختیار کرے جو نہ اُس پر منطبق ہو، نہ اس پر منطبق ہو۔نہ تکرارِ فعل بہ اعتبارِ معمول ہو نہ ایک فعل میں تمام افراد شریک ہوں۔بیچ کا راستہ اختیار کیا جائے کہ ہستیاں تین اور اطاعتیں دو۔

تو اس کا کوئی سبب ہونا چاہئے۔ میں جب اس پر غور کرتا ہوں تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اللہ کی اطاعت تو اصل حاکم کے اعتبار سے ہے اور اس کی حکمرانی ذاتی اور اکیلی ہے۔ اس حکمرانی میں کوئی شریک نہیں ہے۔ ذاتی حیثیت سے حکم کا مرکز صرف اُس کی ذات ہے۔ لہٰذا پہلا ''اَطِيْعُوْا'' جو آیا اس میں اللہ کے ساتھ کسی اور کا نام نہیں لیا گیا۔ اب اس کے بعد جو اطاعت ہوگی، وہ نائب حاکم کے اعتبار سے ہوگی۔ اب جب نائب حاکم کی حیثیت سے اطاعت کروائی گئی تو اگر رسول اور اولی الامر کی اطاعت میں کوئی فرق ہوتا تو جیسے اللہ کیلئے ''اَطِيْعُوا'' الگ آیا، ویسے ہی رسولؐ کے لئے ''اَطِيْعُوا'' الگ آتا اور اولی الامر کیلئے ''اَطِيْعُوا'' الگ ہوتا۔ مگر نہیں۔ ایک ''اَطِيْعُوا'' میں رسول اور اولی الامر دونوں۔

اب یہ ذرا علمی مسئلہ ہے کہ حضور! اگر الفاظ تین ہوں تو یہ ہوسکتا ہے کہ ایک لفظ سے کچھ معنی مراد ہوں، دوسرے لفظ سے دوسرے معنی مراد ہوں، تیسرے لفظ سے کوئی تیسرے معنی مراد ہوں۔ متکلم نے تین مرتبہ لفظ صرف کیا اور ہر لفظ میں اس نے ایک معنی مراد لئے جو قرینہ کلام سے سمجھ میں آ گئے۔ لیکن جب لفظ ایک ہو تو اس میں دو معنی نہیں ہو سکتے۔ تو ایک لفظ ''اَطِيْعُوْا'' ہے جو رسول اور اولی الامر سے متعلق ہے۔ اب جس معنی میں رسولؐ کی اطاعت ہوتی، اسی معنی میں اولی الامر کی اطاعت ہوگی۔ جن قیدوں کے ساتھ رسولؐ کی اطاعت ہوگی، انہی قیدوں کے ساتھ اولی الامر کی اطاعت ہوگی۔ نہ مفہوم میں فرق ہوسکتا ہے اور نہ حدود و قیود میں فرق ہوسکتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اللہ اور رسولؐ کے بیچ میں ''اَطِیْعُوْا'' آیا مگر رسول اور اولی الامر کے بیچ میں اللہ کو لفظ بھی گوارا نہیں تھا۔

تو اصل اطاعت اللہ کی ہے اور رسولؐ کی اطاعت اس اعتبار سے کہ اُس کے احکام ان کی زبان سے معلوم ہوتے ہیں۔ اسی لئے قرآن مجید میں ایک آیت ملتی ہے کہ ارشاد ہوا:

مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ ۚ

''جس نے رسولؐ کی اطاعت کی، اُس نے اللہ کی اطاعت کی''۔

کیا مطلب؟ مطلب یہ کہ تمہیں دو کام نہیں کرنے ہیں، ایک کام ہے جس کے دو نام ہیں۔ وہی ایک نظام ہے، اس کی پابندی اطاعت خدا بھی ہے اور اطاعتِ رسولؐ بھی ہے۔ میرے ذہن میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر بس یہی کہنا ہے کہ یہ دو الگ الگ کام نہیں ہیں، ایک ہی کام کے دو نام ہیں تو یہ کیوں نہ کہہ دیا کہ ''مَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ فَقَدْ اَطَاعَ الرَّسُوْل''۔ جس نے اللہ کی اطاعت کی، اُس نے رسولؐ کی اطاعت کی۔ یہ ادھر سے کیوں کہا کہ جس نے رسولؐ کی اطاعت کی، اُس نے اللہ کی اطاعت کی۔ یہ نہیں کہا اُس نے۔ کیوں نہیں کہا؟

یاد رکھئے، بڑا فرق ہو جاتا نتیجہ میں اگر یہ کہا جاتا کہ جس نے اللہ کی اطاعت کی، اُس نے رسولؐ کی اطاعت کی۔ تو اللہ کی اطاعت کو انسان اپنے نقطۂ نگاہ سے متعین کرتا کہ کس طرح ہم اللہ کی اطاعت کریں۔ اُسے اپنی رائے

سے،جس میں غلطیاں بھی ہوتی ہیں، یا اپنے اجتہاد سے یا اپنے ذہن سے یہ طے کرتا کہ اس راستے پر اللہ راضی ہوتا ہے۔ جب سمجھ لیتا کہ اللہ کی اطاعت ہوئی تو پھر قرآن کی آیت کو لاتا کہ بس رسولؐ کی بھی اطاعت ہوگئی۔

مگر قرآن نے یہ کہا ہی نہیں کہ جو خدا کی اطاعت کرے، اُس نے رسولؐ کی اطاعت کی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ پہلے تمہیں ان کے احکام دیکھنے ہیں، پہلے تمہیں ان کے فرامین پر نظر کرنا ہے، جب ان کی اطاعت ہوجائے تو پھر سمجھ لو کہ اللہ کی اطاعت ہوگئی۔ یعنی مرضیِ الٰہی میں تمہاری نگاہ سند نہیں ہے، رسولؐ کے اقوال سند ہیں۔

اب یہ دو اطاعتیں ہیں الفاظِ قرآنی کے لحاظ سے۔ ایک اطاعتِ خدا، ایک اطاعتِ رسولؐ و اولی الامر۔تو اب مسلمانوں سے پوچھتا ہوں کہ اللہ کی اطاعت میں کوئی قید، کوئی شرط، کچھ ہے کہ اللہ کی اطاعت کن باتوں میں ضروری ہے؟ کن باتوں میں اللہ کی اطاعت ضروری نہیں؟ تو یقیناً مسلمان کیسا، ہر اللہ کا بندہ یہ کہے گا کہ نہیں، اللہ کی اطاعت میں کوئی شرط، کوئی قید نہیں ہے۔ یعنی جو اسکا حکم ہو، کسی بھی شعبۂ زندگی سے متعلق، اس کی اطاعت ضروری ہے۔

اب میں کہتا ہوں کہ دوسری شخصیت رسول کی ہے۔تو اب ماشاء اللہ فرزندانِ اسلام کا مجمع ہے، میں فرزندانِ اسلام سے پوچھتا ہوں کہ رسولؐ کی اطاعت میں کوئی قید ہے؟ قرآن کے الفاظ میں تو جیسے ''اَطِیْعُوا اللّٰہَ'' مطلق ہے، ویسے ہی ''اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ'' مطلق ہے۔ الفاظ میں کوئی قید نہیں ہے۔

رسولؐ کی اطاعت میں کوئی قید ہے کہ کچھ احکام کی اطاعت ضروری ہو اور کچھ احکام کی ضروری نہ ہو؟ چونکہ فرزندانِ اسلام کا مجمع ہے، اس لئے ہر طرف سے آواز آئے گی: بے شک بے شک، رسولؐ کی اطاعت مطلق طور پر فرض ہے۔ ہر شعبۂ حیات میں فرض ہے۔ اب سب طرف سے آوازیں آگئیں۔ ایک گوشے سے آواز آئی، مگر مجھے حیرت ہوئی کہ رسولؐ کے بارے میں یہ کہاں سے آگیا اور وہ بھی مسلمانوں کے مجمع میں سے؟

تو اب میں نے ذرا غور سے سنا کہ کیا ہے؟ تو سنائی یہ دیا کہ بے شک رسولؐ کے احکام پر بھی مطلق عمل واجب ہے مگر رسولؐ کے وہ احکام جو بحیثیت رسولؐ ہوں۔ مگر جو احکام بحیثیت بشر کے ہوں، ان کی اطاعت فرض نہیں ہے۔ میں سیاست کی دنیا کا آدمی تو نہیں ہوں لیکن ایک سنی سنائی بات یاد رہ گئی ہے۔ تو میں کہتا ہوں کہ ملک کے بٹوارے کا اتنا شوق ہے کہ اب رسولؐ کی زندگی کا بٹوارہ بھی ہونے لگا۔

یاد رکھئے کہ کسی چیز کی رَد کرنا اس پر موقوف ہے کہ اس کے کچھ معنی سمجھ میں آئیں۔ یہ بات کہ بحیثیت رسول جو احکام ہوں، ان کی اطاعت فرض ہے اور بحیثیت بشر جو احکام ہوں، ان کی اطاعت فرض نہیں ہے۔ رسولؐ کی زندگی منقسم ہے کہیں تک؟ آپ فقط بشر ہیں اور کہیں سے آپ رسولؐ بھی ہیں۔ تو میں اس کے کچھ معنی ہی نہیں سمجھتا۔ اس کی رد کا کیا سوال ہے؟ میں کہتا ہوں کہ رسالت سے بہت کم جو درجے ہوں، میں اس میں اس کا تصور نہیں کرتا۔ ارے صاحب! سب سے کم تر درجہ مسلم کا ہے کہ یہ مسلمان ہے۔ تو اگر کوئی مسلمان

ہے تو اس کے ہاں میں یہ تصور نہیں کرسکتا کہ کہاں تک وہ فقط آدمی ہو اور کہاں سے مسلمان ہو؟

میں کہتا ہوں کہ مسلمان ہے تو ہر شعبۂ حیات میں مسلمان ہے۔ کوئی شعبۂ حیات ایسا نہیں ہے جس میں مسلمان نہ ہو۔ یہ دوسرے مذاہب میں ہوسکتا ہے جہاں کچھ وظائف سے مذہب کا تعلق ہے۔ عیسائیوں کے ہاں ہوسکتا ہے کہ ہفتہ میں ایک دن گرجا چلے گئے تو بس معلوم ہوا کہ عیسائی ہیں اور اس کے بعد چھ دن ڈاکٹر ہیں، وکیل ہیں، جو کچھ اور ہیں، وہ ہیں۔ اس میں عیسائیت کا دخل نہیں ہے۔ لیکن اسلام ایسا نہیں ہے۔ یعنی میں مختصر جملہ اس کیلئے یہ کہوں گا کہ اسلام میں دین جزوِ حیات نہیں ہے، کل حیات ہے۔ جو کوئی مسلمان ہے، وہ منزلِ زندگی میں بھی مسلمان ہے۔ محلہ کی زندگی میں بھی مسلمان ہے، باہر کی زندگی میں بھی مسلمان ہے۔ ہر معیار سے مسلمان ہے۔ ڈاکٹر ہو، وکیل ہو، تاجر ہو، کچھ بھی ہو، جو بھی ہو اس میں سوال یہ ہے کہ مسلمان ڈاکٹر ہے یا نہیں، مسلمان وکیل ہے یا نہیں؟ کوئی کہے کہ صاحب ابھی تو ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ ڈاکٹر ہونے میں مسلمان ہونے کا کیا دخل ہے؟

تو میں عرض کرتا ہوں کہ ایک مریض ایسا آیا کہ جس کی شکایت معمولی ہے، کسی بھی ڈاکٹر کے پاس جائے تو نسخہ لکھ دے گا، ٹھیک ہو جائے گا۔ غیر اہم بیماری ہے۔ تو اپنی جگہ یہ سوچتے ہیں کہ اس وقت کوئی غیر معمولی فیس مانگنے کا موقع نہیں۔ بس جتنی رسمی فیس ہے، وہ مل جائے تو مل جائے۔ لیکن اگر کوئی پیچیدہ مرض آ گیا جس کے متعلق اپنی مہارتِ فن سے سمجھ لیا کہ سوائے میرے کوئی

علاج نہیں کرسکتا۔ پیشے کا تقاضا یہ ہے کہ اپنی مہارتِ فن کی پوری قیمت وصول کرنے کا موقع ہے۔ سمجھتے ہیں کہ یہی تو شکار ملا ہے، یہ تو پیشے کا تقاضا ہے۔مگر اسلام کا تقاضا کیا ہے کہ اگر سمجھتے تھے کہ کوئی اور بھی علاج کرسکتا ہے تو علاج کرنا تم پر واجب نہیں تھا۔لیکن جب تم نے خود سمجھ لیا کہ اس کی زندگی تمہارے علاج پر موقوف ہے تو اب اس کا علاج تم پر واجب عینی ہے۔ اگر تم مول تول میں لگے رہے اور وہ مر گیا تو تم قاتل نفس قرار پاؤ گے۔

تو اب دیکھا آپ نے کتنا مشکل ہے مسلمان ڈاکٹر ہونا۔اور مسلمان وکیل؟ جناب اگر مقدمہ ایسا ہے صاف صاف ،دستاویز کے لحاظ سے حقیقت ثابت ہے تو سمجھتے ہیں کہ یہ ہر ایک وکیل کرے گا،لہٰذا بس جو رسمی فیس ہے، وہ لے لو۔لیکن اب وکیلوں کی زبان میں کہوں گا کہ اگر ایسا مقدمہ آیا جو بالکل بے جان ہے، بے جان ہونے کے معنی یہ ہیں کہ بالکل غلط ہے تو اب وکالت کے پیشے کا تقاضا یہ ہے کہ یہی تو مقدمہ ایسا ہے کہ جس میں زیادہ سے زیادہ روپیہ حاصل کیا جائے۔لیکن مسلمان ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ جب سمجھ لیا کہ مقدمہ جھوٹا ہے تو اسی وقت چھوڑ دے کہ ہم کسی جھوٹے مقدمے کی پیروی نہیں کرتے۔ دیکھا آپ نے کہ کون وکیل ہے اور کون مسلمان وکیل ہے؟

اور جنابِ تاجر! اگر آپ فاضلاتِ حیات کے تاجر ہیں، یعنی جو چیزیں نظامِ زندگی کا جزو نہیں ہیں۔فرنیچر بیچتے ہیں، سامانِ آرائش بیچتے ہیں، یہ چیزیں آج کی تہذیب کے کتنے ہی لوازم میں سے ہوں مگر ضروریاتِ حیات میں سے نہیں ہیں۔تو اس میں آپ جتنی چاہے نفع اندوزی کر لیجئے۔کوئی حکومت

جتنا چاہے، کنٹرول کرے، مگر ہمارے نزدیک حکومت کا کوئی کنٹرول، کوئی شدید پابندی نہ ہوگی اس پر۔ اس لئے کہ مالک کو اختیار ہے اپنی چیز جتنے میں چاہے بیچے، ہاں جھوٹ نہ بولے۔ یہ نہ کہے کہ میں نے اتنے میں خریدی تھی،نہیں۔ کہے کہ میری چیز ہے، میں اتنے میں بیچوں گا۔

جتنی زیادہ سے زیادہ چاہے قیمت مقرر کردے، تب تو حق ہے،لیکن اگرضروریاتِ زندگی کا تاجر ہے،غلہ کا تاجر ہے۔ غلے سے بقائے حیات ہے۔ اگرغلہ بازار میں فراواں ہے، کثرت سے ہےتو پیشہ کہتا ہے کہ یہاں زیادہ نفع اندوزی کی گنجائش نہیں ہے۔ہم زیادہ مانگیں گےتو وہ کہیں اور چلا جائے گا۔مگر کمی ہے، بازار میں قحط کا زمانہ ہے۔اس نے اپنی ترکیبوں سے سٹاک کافی رکھ چھوڑا ہےاوردوسرے لوگوں کے پاس وہ نہیں ہے۔ضروریات کے طلبگاروں کواس کے پاس آنالازمی ہے۔

اب یہاں اسلام کہہ رہاہے ''اَلْمُحْتَکِرُ مَلْعُوْنَ''، جو تین دن تک اضافہ قیمت کی اُمید میں غلہ روکے، وہ محل لعنت ہے اور اب یہاں ایک پہلو سیرتِ معصومینؑ کا میرے سامنے آ گیاہے۔ یادرکھئے احتکارکامسئلہ تجارت میں ہے۔وہاں یہ ہے کہ نفع اندوزی کی خاطر اُسے روکونہیں،لیکن کوئی انسان اپنی ذاتی ضروریات کیلئے،آسانی کیلئے زیادہ غلہ رکھے، اپنے اہل وعیال کی سہولت کیلئےتو یہ قانونِ شریعت سےممنوع نہیں ہے۔مگر یادرکھئے کہ آلِ رسولؐ وہ تھے جو اپنا معیارشریعت کی پابندیوں سےاور بالاتر رکھتے تھے۔آگے رکھتے تھے۔

حضرت امام جعفر صادقؑ کے زمانہ میں قحط پڑا۔قحط کے ایسے آثار

نمودار ہوئے کہ لوگ اب نانِ شبینہ کو محتاج ہو جائیں گے اور بہت مشکل سے اناج ملے گا۔ حضرتؑ نے اپنے توشہ خانے کے منتظم کو بلا کر دریافت فرمایا کہ ہمارے توشہ خانے میں مہمانوں کیلئے کتنا غلہ موجود ہے؟ وہ سمجھا کہ حضرتؑ کچھ پریشان ہیں تو اس نے بڑے اطمینان کا سانس لے کر کہا کہ حضورؑ! ہمارے پاس تو اتنا ہے کہ یہ فصل ہم آسانی سے کاٹ لے جائیں گے۔ یہ حضرتؑ کے گویا اطمینان دلانے کیلئے کہا۔ آپؑ نے کہا: بس! اچھا ہے معلوم ہو گیا۔ کل یہ غلہ بازار میں لے جانا اور یہ سب فروخت کر دینا۔

اُس کے چہرے کی رنگت اُڑ گئی۔ بالکل گویا اصولِ معاشیات کے خلاف ہدایات۔ اُس نے کہا: مولاؑ! پھر ہم بڑی مصیبت میں پڑ جائیں گے۔ زحمت میں ہو جائیں گے۔ آپؑ نے فرمایا: یہی تو میں چاہتا ہوں کہ اس سب کو فروخت کر دو۔ جس حال میں سب مسلمان ہیں۔ اُسی حال میں ہم بھی ہو جائیں گے۔

دیکھا آپ نے، قرآن اور اس کے ساتھ لفظی تعلیمات کہاں تک رہتے ہیں اور قرآنِ ناطق کا کردار کتنی بلندی پر جاتا ہے۔ میں تاجروں کو چھوڑتا نہیں، اس کا تصور کر کے کہ بانیانِ مجلس ماشااللہ تاجر ہیں مگر ایک صاحب نے تحریک بھی کر دی۔ وہ بلا تحریک بھی ہوتا مگر جب ان تک پہنچا ہوں تو اپنے کو کیوں چھوڑوں؟ جبکہ بہرحال اس دَور میں کون مولوی ہے اور کون مسلمان مولوی ہے۔ اگر ہمارے سامنے مسئلہ پیش کر دیا، دیکھ کر فوراً ہمارا ذہن گیا کہ کون کون بڑے آدمی اس سے خفا ہو جائیں گے؟ کن لوگوں کی مرضی کے

خلاف ہوگا۔ کن لوگوں کے مفادات کو اس سے نقصان پہنچے گا؟ یا وہ محسوس کریں گے نقصان۔ اگر یہ سب تصور میں آ گئے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم مولوی ہیں مگر مسلم مولوی نہیں ہیں۔ اگر استثنیٰ ہو اور ہم یہ پیش نظر رکھیں کہ رضائے حق کس چیز میں ہے اور یہ پیش نظر رکھیں کہ اصل حکم الٰہی کیا ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اب مسلم ہوں گے۔

اب یہ آپ نے دیکھ لیا کہ ایک مسلمان میں یہ تصور نہیں ہوسکتا کہ کس حد تک وہ فقط آدمی ہے اور کس حد تک وہ مسلمان ہے۔ اب مسلمان کے آگے درجہ ہے ہمارے نزدیک عدالت کا۔ جس کے پیچھے نماز پڑھنے کی شرط ہے، ہر مسلمان کے پیچھے ہمارے نزدیک نماز نہیں ہوتی۔ عادل کے پیچھے نماز ہوتی ہے تو عادل کے لئے میں یہ تصور نہیں کرسکتا۔ کہ کہاں تک وہ آدمی ہو اور کہاں سے عادل ہو؟ اگر عادل ہے تو گھر میں بھی عادل ہے، محلے میں بھی عادل ہے، ملک میں بھی عادل ہے۔ اس میں یہ تفریق نہیں ہوسکتی۔ جب ان چیزوں میں مَیں یہ تصور نہیں کرسکتا جو کمتر درجہ کی ہیں تو رسالت میں کیونکر تصور کروں کہ کہاں تک یہ فقط بشر ہیں اور کہاں سے رسولؐ ہیں؟

اب ایک اور پہلو کی طرف عقلی حیثیت سے توجہ دلاؤں کہ اگر یہ دین وہ ہوتا کہ جو دین دنیا کے شعبوں سے الگ ہو تو اس کے پیغمبر میں بھی یہ تفریق ہوسکتی۔ لیکن جب یہ دین وہ ہے جس سے کوئی شعبہ حیات باہر نہیں تو پیغمبرؐ خدا میں یہ تفریق کیونکر ہوسکتی ہے کہ آپ کہیں پر بشر ہوں اور کہیں سے رسولؐ ہوں۔

اب ایک پوری سیرت کی کتاب میں سمیٹ کر چند الفاظ بیان کروں

خالق نے اس سب کو سمیٹ کر ایک سند دی:

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ﴿٤﴾

اے پیغمبرؐ! آپ عظیم اخلاق کے درجہ پر فائز ہیں''۔

یہ خدائے اکبر و خدائے اعظم دنیائے سیرت میں انؐ کے کردار کو عظیم کہہ رہا ہے تو آپ خلق عظیم کے درجہ پر فائز ہیں۔ کسی شعبۂ حیات میں ان کی سیرت کو اس نے مستثنٰی نہیں کیا۔ تو اب اس کو میں پھیلا کر چند الفاظ میں بیان کروں۔ پھیلاؤں گا ایسا کہ ساری زندگی پر حاوی۔ مگر اختصار ایسا ہوگا کہ چند لفظوں میں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ یہ جو خالق نے کہا کہ آپ یقیناً خُلقِ عظیم کے درجہ پر فائز ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنی اولاد کیلئے آپ سے بہتر باپ کوئی نہیں، اپنی شریک حیات کیلئے آپ سے بہتر شوہر نہیں کوئی، اپنے پڑوسیوں کیلئے آپ سے بہتر پڑوسی کوئی نہیں، اپنے محکوموں کیلئے آپ سے بہتر حاکم نہیں اور اپنے خدا کا آپ سے بہتر بندہ بھی کوئی نہیں ہے۔

اب اس دعوے کے کھوکھلے پن کو بہت سادہ لفظوں میں آپ کے سامنے پیش کروں کہ احکام تو ہم آپ کی زبان سے سب سنتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ کچھ احکام بحیثیت بشر ہوتے ہیں، کچھ احکام بحیثیت رسولؐ۔ تو ان کے ساتھ ساتھ کوئی رسول ہونا چاہیئے جو بتا تا رہے کہ کون سا حکم بطورِ بشریت ہے اور کونسا حکم بطورِ رسالت ہے؟ تو پھر آپ کی زندگی رہنما ہی نہیں ہوگی۔ پھر حکم کو ٹالا جا سکے گا یہ کہہ کر کہ یہ بشریت کا تقاضا تھا۔

دیکھئے! مخالفتوں کو نبھانے کیلئے کتنے چوردروازے اختیار کیے ہیں تو معلوم ہوا کہ وہ ''مگر'' جو تھا، وہ مردہ مگر تھا کوئی۔ اس مگر میں کوئی زندگی نہیں تھی۔ تو جس طرح اللہ کی اطاعت غیر مشروط، اسی طرح رسولؐ کی اطاعت غیر مشروط۔ اب بغیر دوسرا ''اَطِیْعُوا'' لائے ہوئے اسی پہلے ''اَطِیْعُوا'' کے تحت بلافصل رسولؐ کے ساتھ اولی الامر ہے۔ اب یہاں اولی الامر میں، بس ایک لفظ میں لوگ اُلجھتے ہیں، اولی الامر۔ یہ اولی جمع ہے ذی کی۔ ذی کے معنی صاحب کے ہوتے ہیں۔ ذی علم یعنی صاحبِ علم تو اولی الامر یعنی صاحبانِ امر۔ یہ معنی ہوئے اولی الامر کے۔ تو اب کہتے ہیں کہ ہم دیکھ لیں گے کہ کون لوگ برسرِ امر ہیں اور امر نافذ کر رہے ہیں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ صاحبِ امر۔ یہ معنی ہوئے اولی الامر کے۔ تو آپ کہتے ہیں کہ ہم دیکھ لیں گے کہ کون برسرِ امر ہیں اور امر نافذ کر رہے ہیں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ صاحبِ خانہ، صاحبِ خانہ وہی صاحب کا لفظ ہے۔ صاحبِ خانہ وہ ہوتا ہے جو مالکِ خانہ ہو یا وہ ہوتا ہے جو غاصبِ خانہ ہو۔ انگریزوں کے زمانہ میں ہمارے ملک میں قانون تھا اور غالباً اب بھی ہے کہ بارہ برس کے قبضے میں ڈگری مل جاتی تھی، وہ مالک مان لیا جاتا تھا۔ مگر جو نظامِ الٰہی ہے، وہی ہی نظامِ مصطفیٰ ؐ ہے۔ تو اس نظامِ الٰہی میں بارہ برس کیا، چودہ برس گزر جائیں، ناجائز قبضے کو حقِ ملکیت نہیں ملتا۔ اسی لئے اولی الامر کے معنی ہیں حقدارانِ امر۔

یہ نہ دیکھئے کہ کون حکم چلا رہا ہے، یہ دیکھئے کہ حکم چلانا کس کا حق ہے۔ جس کا حق ہو، وہ ہے اولی الامر۔ دوسرے الفاظ میں جس سے لوگ اُلجھتے ہیں،

فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں، وہ لفظ ''مِنْكُمْ'' ہے کہ اولی الامر جوتم ہی میں سے ہیں، تو خیال کرتے ہیں کہ ہم میں سے ہیں تو ہمارے بھائی بند ہیں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ ''مِنْكُمْ'' تو یہاں سے مخصوص نہیں۔ رسول کو بھی کہا گیا ہے:

''بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلاً مِنْهُمْ''۔

اس نے اُمیین میں رسول بھیجا، انہی میں سے۔ تو رسول کو بھی کہا گیا ''مِنْهُمْ'' اولی الامر کو بھی کہا گیا ''مِنْكُمْ''۔ تم ہی میں سے۔ تو رسول بھی ان ہی میں سے تھا مگر ان کا مقرر کیا ہوا نہیں تھا۔ ویسے ہی بالکل اولی الامر بھی تم ہی میں سے ہیں مگر تمہارے مقرر کئے ہوئے۔ اور ہم نے اولی الامر کے جو معنی ہیں، اسی کے مطابق اپنا محاورہ قرار دیا ہے۔ اولی الامر کے معنی میں نے کیا کہے تھے؟ صاحبانِ امر۔ ہم ہر دور کے اس فرد کو صاحب الامر کہتے ہیں۔

اب جنابِ والا! میں نے یہ سوال شروع میں اٹھایا تھا کہ یا ایک ''اَطِيْعُوْا'' ہوتا اور تینوں کی اطاعت کا حکم ہوجاتا ایک لفظ سے اور یا تین کی اطاعت کروانا تھی تو تین الفاظ ہوتے۔ مگر قرآن مجید نے وہ طریقہ اختیار کیا، نہ یہ طریقہ اختیار کیا۔ اللہ کو تو اکیلے کہا ''اَطِيْعُوْا'' کے ساتھ۔ یعنی اس معنی میں جو اللہ کی اطاعت ہے، کوئی شریک نہیں ہے اور اس کے بعد اب ایک ''اَطِيْعُوْا'' میں رسول اور اولی الامر۔ جس طرح رسولؐ کی اطاعت کا براہِ راست اس کی طرف سے پیغام، اسی طرح اولی الامر کی اطاعت کا براہِ راست اس کی طرف سے پیغام۔ اس لئے دنیا کو بڑی دشواری پیش آئی۔ اس عہدہ کا

نام رکھنے میں۔ وہ دشواری تاریخ میں درج ہے کہ وہاں امامت کا تصور نہیں کیا گیا۔اس کے بعد نظام خلافت چلا۔تو اب خلیفہ کے معنی جانشین۔تو اب کس کا جانشین؟ رسولؐ کا۔

توحضور! وہ پہلی دفعہ تو بات نبھ گئی۔اب ایک اضافت دے دی کہ خلیفہ رسول اللہ۔رسولؐ خدا کا جانشین۔اب ایک کڑی جب تک رہی، تب تک تو آسان رہا۔اب دوسری کڑی بیچ میں آئی اس کے بعد۔وہ یقیناً دوررس آدمی تھے۔ان کے ذہن میں بھی دشواری آئی۔پہلے دن ہی سوچ لیا ہوتا۔مگر جب اپنی نوبت آئی تو دشواری پیدا ہوئی کہ وہ تو رسولؐ اللہ کے جانشین۔اب دوسرا کیا ہوگا؟ رسولؐ خدا کے جانشین کا جانشین۔ایک ''کا'' کے بعد ایک اور ''کا''۔

اب خیر دوسری منزل میں نبھا لیا جاتا۔مگر وہ سلسلہ بھی تو رہے گا۔لہٰذا اب اس کے بعد کیا ہوگا؟ اب جتنے آدمی ہوں، اتنے، ''کا''۔دن بھر کا۔ ''کا'' کہئے اور آخر میں جانشین۔کہہ دیجئے تو یہ دشواری محسوس ہوئی۔اب مجلس شوریٰ مرتب ہوئی۔ایسی ہی مشکلات میں مجلس شوریٰ مرتب ہوئی ہے۔مگر اب یہ معاملہ ایسا تھا کہ اُس شخص کو اس محفل میں نہیں لایا گیا جس سے سمجھتے تھے کہ بنیادی اختلاف ہے ورنہ ہر مجلس شوریٰ میں اہم معاملات میں اُس سے رائے لی جاتی تھی۔اس میں بھی بلاتے۔مگر یہاں کوئی روایت نہیں بتاتی کہ بلایا۔اور جو بھائی بند تھے، جو اس نظام کو مان رہے تھے، ان کو بلایا اور کہا کہ بھئی یہ مشکل ہوئی کہ وہ تو رسولؐ خدا کے خلیفہ۔اب میں آیا۔تو میں کہاں جاؤں؟ رسولؐ اللہ کے خلیفہ کا خلیفہ۔اب اس کے بعد جو آئے، اسے کیا کہا جائے؟ تین دفعہ ''کا''

آئے، تب جا کر اس کا نام لیا جائے۔ تو کسی آدمی نے رائے دی کہ صاحب! اس جھگڑے ہی میں نہ پڑیئے بلکہ ہم مؤمنین ہیں، آپ ہمارے امیر ہیں۔ اتنی مصیبت کے بعد بھی لقب آیا بھی تو غیر کا جو مل چکا تھا بارگاہِ رسالتؐ سے کسی کو۔

بہرحال اس مشکل سے نجات مل گئی۔ لیکن ہماری نظر میں کوئی مشکل نہیں۔ ارے ہمارے ہاں اتنے درجن نہ سہی، بارہ تو ہیں سہی۔ الحمدللہ! اب ان بارہ میں ہمیں کوئی دشواری نہیں کہ بارہ دفعہ ''کا'' کہیں، تب جا کر عہدہ کا پتہ چلے۔ ہمیں یہ دشواری نہیں کیونکہ یہ تو شخصیت کی طرف نسبت رکھی۔ رسولؐ کی طرف۔ اس لئے یہ دشواری پیش آئی اور ہمارے اصول کے ماتحت علیؑ بھی خلیفۃ اللہ، حسنؑ بھی خلیفۃ اللہ، حسین بھی خلیفۃ اللہ، جتنے بھی ہیں سب خلیفۃ اللہ۔

وہ بات اس کے ساتھ آ گئی کہ اللہ کے نام کے ساتھ تو اکیلا ایک لفظ ''اَطِیْعُوْا'' کا آیا، اس لئے کہ ذاتی حق حکومت اسی کا۔ اس کے ساتھ کسی کی شرکت نہیں اور اب اس کے بعد رسول اور اولی الامر۔ سب کی نوعیت ایک یعنی وہ بھی نائب حاکم، یہ بھی اپنے دَور میں نائب حاکم۔ نائب خدا ہونے کی حیثیت ان سب میں مشترک ہے اور یاد رکھئے کہ یہی فرق ہے۔ ہمارے آئمہ نائب خدا ہیں اور علماء نائب امام کہلاتے ہیں، نائب خدا نہیں کہلاتے۔

تو اب حدود میں کوئی فرق ہوسکتا ہے؟ جس دائرے میں خدا کی اطاعت، اُسی دائرے میں رسولؐ کی اطاعت، اسی دائرے میں اولی الامر میں سے ہر فرد کی اپنے اپنے دور میں اطاعت۔ اور وہ یکے بعد دیگرے اطاعتیں ہوں گی۔ جتنے ورق الٹتے جائیں گے، اتنی ہی ہستیاں سامنے آتی

جائیں گی اور ہرامام اپنے دور کا صاحب الامر۔ رسولؐ سب سے پہلے اپنے دور میں صاحب الامر تھے۔ انؐ کے بعد حضرت علی ابن ابی طالبؑ صاحب الامر تھے اوراسی طرح وہ پورا سلسلہ اولی الامر کا ہے جو سب پر حاوی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان سب کی اطاعتیں رسولؐ کی اطاعت سے جدا نہیں ہیں۔ اب اللہ کے ساتھ رسولؐ کی اطاعت اور وہ بھی غیر مشروط اور یہ بھی غیر مشروط۔

میں نے کہا کہ عقلی طور پر یہ نہیں ہوسکتا جب تک یہ نہ مانا جائے کہ ان کا حکم اللہ کے حکم سے کبھی نہیں ٹکراتا ورنہ اگر احکام میں ٹکراؤ ہوجائے تو اس موقع پر آدمی یا اُس کی اطاعت کرے یا ان کی اطاعت کرے۔ اور وہ مطلق کہہ رہا ہے کہ میری اطاعت کرو، وہ مطلق کہہ رہا ہے کہ ان کی اطاعت کرو۔ تو اس کا مطلب یہ کہ جو میرا حکم، وہی ان کا حکم ان کا حکم کبھی میرے حکم سے الگ نہیں ہوگا اور اب اگر ایک ذات تک بات رہتی تو اس کیلئے یہ بات ہوتی اور اگر اس کے ساتھ ایک سلسلہ ہے جو اولی الامر کا ہے تو ماننا پڑے گا کہ ان میں سے کسی کا حکم کبھی اللہ کے حکم سے نہیں ٹکراتا۔

یادرکھئے! اسی کو ہماری زبان میں معصوم کہتے ہیں۔ کسی کا حکم کبھی اللہ کے حکم سے نہیں ٹکراتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ زبانیں چودہ کی ہیں لیکن بات ایک ہے۔ جو ان کی زبان سے بات سنی گئی، وہ ایسی ہے جیسے اللہ کی زبان سے بات سنی جائے۔ چودہ کی زبانیں ہیں مگر حکم ایک ہے اور قرآن مجید میں رسولؐ کے اتباع کا بھی حکم ہے کہ ان کی پیروی کرو اور اتباع کے معنی نقش قدم پر چلنا۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جب مطلق طور پر اطاعت کا حکم دیا تو اس کے معنی یہ ہیں

کہ اعمال کی صحت کی ضمانت ہوئی۔ چونکہ ہماری اُردوزبان ذرا کوتاہ ہے، تو ہم اطاعت کے بھی معنی کہہ دیتے ہیں پیروی اور اتباع کے معنی بھی کہہ دیتے ہیں پیروی۔ مگر عربی زبان کے لحاظ سے اتباع اور اطاعت کے معنی میں فرق ہے۔ اطاعت ہوتی ہے احکام کی اور اتباع ہوتا ہے اعمال کا۔ تو جب خالق نے کہا:

اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ

اللہ کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اطاعت کرو۔ تو اس کے معنی ہیں رسولؐ کے احکام کی صحت کی ضمانت ہوئی اور جب کہا:

قُلۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوۡنِیۡ یُحۡبِبۡکُمُ اللّٰہُ

کہئے کہ اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو۔ تو اس کے معنی ہیں کہ ان افعال کی صحت کی ضمانت دی اور اسی لئے ان کے قول کو اپنا قول قرار دیا۔

وَمَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡہَوٰی ﴿۳﴾ اِنۡ ہُوَ اِلَّا وَحۡیٌ یُّوۡحٰی ﴿۴﴾

ہمارا رسول خواہش نفس سے کلام نہیں کرتا۔ یہ تو وہی کہتا ہے جو اس پر وحی ہوتی ہے۔

ان کے کام کو بھی اپنا کام قرار دیا ہے۔ ارشاد ہوا:

وَمَا رَمَیۡتَ اِذۡ رَمَیۡتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی ۚ

''وہ سنگریزے آپ نے نہیں پھینکے، اللہ نے پھینکے۔

اور ہاتھ جو کام کا ذریعہ ہوتا ہے، اُسے بھی اپنا ہاتھ قرار دیا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ؕ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ

یہ جو آپ سے بیعت کررہے ہیں، یہ آپ سے بیعت نہیں کررہے، یہ اللہ سے بیعت کررہے ہیں۔ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ کے اوپر ہے۔

اب میں ہر نقطہ نگاہ کے مسلمان کو دعوتِ فکر ونظر دیتا ہوں۔ ذرا غور کیجئے۔ سب قرآن کی آیات میں نے پڑھی ہیں کہ جس کا قول اللہ کا قول ہو، جس کا عمل اللہ کا عمل ہو، جس کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ ہو اگر (معاذ اللہ) اس سے غلطی ہو تو کس کی غلطی ہے؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں کے سامنے رسولؐ کے معصوم ہونے کا سوال نہیں بلکہ بندوں کے سامنے اللہ کے بے خطا ہونے کا سوال ہے۔ اگر خالق نے ان کے نام کے ساتھ ایک اور افراد کا سلسلہ بیان کیا۔ ''اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ''، تو پھر ماننا پڑے گا کہ کچھ ہستیاں اور ایسی ہیں کہ جن کے احکام کبھی احکامِ الٰہی سے نہیں ٹکراتے۔ جب ہی تو مطلق طور پر ان کی اطاعت کا حکم دیا، اب اللہ کے احکام معلوم ہونے کا ذریعہ کتابِ الٰہی اور رسولؐ کے احکام اور اولی الامر کے احکام، اگر یہ سب کتابِ الٰہی میں درج ہوتے تو اللہ الگ سے ان کا نام ہی کیوں لیتا؟

میں کہتا ہوں کہ جس وقت خالق نے حکم دیا:

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ

اللہ کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اطاعت کرو اور اولی الامر کی۔

تو جسے بعد میں نعرہ لگانا تھا، وہ اسی وقت کہہ دیتا، تیرا حکم کافی ہے۔ معلوم ہوا کہ احکامِ الٰہی کچھ خود اس کے کلام میں ہیں۔ اس کیلئے ''اَطِیْعُوْا اللّٰہ'' کافی تھا۔ لیکن اس کے احکامات کچھ رسولؐ کے ارشادات ہیں۔ اسی کے احکام کچھ ہر دور کے اولی الامر کے ارشادات ہیں۔ لہٰذا ان سب کو جب تک نہ مانے، اس وقت تک دین کامل نہیں ہوسکتا۔ اب ایک آیت آپ کو یاد دلاؤں جس کے معنی سمجھنے میں دنیا کو اختلاف ہوتا ہے۔ شک ہوتا ہے۔ بہت الجھتی ہے کہ رسولؐ نے عمر بھر تبلیغ فرمائی اور کتنی زحمتیں اٹھائیں۔

''مَا اُوْذِیَ نَبِیٌّ کَمَا اُوْذِیْتُ''۔

''کسی نبی کو اتنی ایذائیں نہیں پہنچیں، جتنی مجھ کو پہنچائی گئیں''۔

عمر بھر تبلیغ فرمائی۔ اس میں کسی مسلمان کو شک نہیں ہوسکتا۔ لیکن اب آخر میں کوئی بات آتی ہے، کیا ہے وہ بات؟ اس سے بحث نہیں۔ کچھ تو ہے کہ کہا گیا۔ اس کو پہنچایئے، نہیں تو؟ اگر یہ نہیں پہنچایا گیا تو کچھ بھی نہیں پہنچایا۔

میں کہتا ہوں جس نے اتنی زحمتیں اٹھائی ہوں تبلیغِ رسالت میں اور اب اس کے آخری عمر کے حصہ میں، جب تین مہینے کے بعد وہ اس دنیا سے اٹھ جائے گا، اب ایک امر پر انحصار قرار دیا جائے کہ یہ پہنچایئے ورنہ کچھ بھی نہیں پہنچایا۔ تو اسی سے مسلمانوں کو سمجھ لینا چاہیے۔ میں کہتا ہوں کہ ضرورت کے تحت تفسیر قرآن ہی ڈھونڈنا چاہیے کہ وہ کونسی بات ہے جس کی وجہ سے کہا گیا کہ اگر

یہ آپؐ نے نہ پہنچایا تو کچھ بھی نہیں پہنچایا۔

اب میں عقلی طور پر آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں کہ یاد رکھئے ان کی عمر بحیثیت، بشر، اب یہاں بشر میں خود میں سے کہتا ہوں۔ یقیناً رسولؐ کے ساتھ بشر بھی تھے۔ اس کا انکار انکارِ قرآن ہے۔ تو بحیثیتِ بشر رسولؐ کی عمر کل جمع تریسٹھ برس۔ جس میں سے چالیس برس قبل بعثت اور کل جمع تیئیس برس بعد بعثت۔ آپ کی رسالت؟ رسالت کی عمر کیا ہے؟ تا قیامت

میں کہتا ہوں کہ تا قیامت کہنا ہی ہمارے حدودِ تعبیر کی کوتاہی ہے۔ اگر قیامت تک ہی رسالت ہے تو شفاعت کس اعتبار سے؟

تو لامحدود رسالت یعنی جب تک خدا کی خدائی ،تب تک ان کی رسالت ۔مگر ہمیں اطاعت کرنا ہے قیامت تک کیونکہ اس کے بعد دارِ تکلیف نہیں ہے۔ اس کے بعد جزا وسزا کی منزل ہے۔ تو ہمیں اطاعت کی پابندی قیامت تک ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ خالق کی طرف سے یہ قیامت تک کی عملی رہبری کی ذمہ داری لے کر آئے ہیں۔ تو اب ایک عام بات ہے کہ کسی کے ذمہ دس برس کا کام ہو اور پانچ برس کرے تو اس نے کچھ تو کیا۔ اگر دس برس کا کام کسی کے ذمہ ہے اور وہ ایک منٹ کرے تو کیا کیا؟ یعنی مقامِ قلت میں درجہ نسبت کا ایسا آتا ہے جو حکم عدم میں ہے۔ تو اب میں کہتا ہوں کہ رسولؐ کی اطاعت وقتِ وفات تک۔ آپ کی کارگزاری تیئیس برس اور رسالت کی عمر تا قیامت۔

کوئی حساب دان مجھے بتائے کہ تیئیس برس کی نسبت عمر دنیا سے جو قیامت تک ہے، کتنی ہے؟ چوتھائی ہے۔ دسواں حصہ ہے، کوئی ہے نسبت؟ کوئی

بھی تو نسبت نہیں ہے۔تو یہی خالق نے کہا ہے کہ اے رسولؐ! آپ نے زندگی بھر تو زحمت اٹھائی اور تبلیغِ رسالت فرمائی لیکن اب اپنے بعد کا انتظام کر جایئے اور اگر یہ نہ کیا تو کچھ نہ کیا۔کم سے کم اس وقت پہلی کڑی جو ہے،اس کا اعلانِ عام آپ کر جایئے۔

ہر دنیا سے جانے والا اپنے بعد آنے والے کا تعارف کرواتا رہے گا اور یوں اور حدیثوں میں تو حضرتؐ نے نام بنام بتا دیا قیامت تک کیلئے لیکن اس وقت پہلی کڑی کا تعارف ہو جائے تو کام قیامت تک چلتا رہے گا۔بس یہ نہ کیا تو کچھ نہ کیا۔اب ہر نقطہ نظر کا مسلمان میرے ایک جملے پر غور کرے کہ جس چیز کی تبلیغ کے بغیر خالق کہے کہ آپ کی رسالت کچھ نہیں، اس کو مانے بغیر ہمارا ایمان کیا رہے گا؟

پھر رسولؐ نے متفق علیہ حدیث پورے سلسلہ کا ایک مجمل تعارف بھی کروایا:

اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ کِتَابَ اللّٰہِ وَعِتْرَتِیْ اَھْلُ بَیْتِیْ مَااِنْ تَمَسَّکْتُمْ بِھِمَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ

''میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑتا ہوں، ایک اللہ کی کتاب، دوسرے میرے اہل بیتؑ۔ جب تک ان سے تمسک رکھو گے، کبھی گمراہ نہیں ہوگے اور یہ دونوں کبھی جدا نہیں ہوں گے''۔

دونوں کون؟ قرآن اوراہل بیتؑ۔ یہ دونوں کبھی جدانہیں ہوں گے یہاں تک کہ روزِ قیامت حوضِ کوثر پر پہنچیں۔ بس اب میں مسلمانوں سے پوچھتا ہوں کہ رسولؐ نے فرمایا: یہ دونوں کبھی جدانہیں ہوں گے۔ اب کسی بھی نقطۂ نظر کا مسلمان ہو، وہ بتائے کہ آج قرآن ہے؟ توکون ہے جو کہے کہ نہیں ہے ۔اب میں پوچھتا ہوں، وہ جسے رسولؐ نے کہا تھا کہ کبھی جدانہیں ہوں گے، ان میں سے کوئی فرد ہے؟ اگر کہہ دیا کہ نہیں ہے تو جدا ہو گئے۔تو ہمارے اورآپ کے رسولؐ نے کہا تھا کہ جدانہیں ہوں گے۔ اب میں ایک جملہ کہوں کہ یہ وہ رسولؐ ہے جسے مشرک بھی صادق کہتے تھے، اب مسلمان ہوکرآپ کواختیار ہے۔

اگر کہے کہ ہے اوررسولؐ کی سچائی کی بناء پر کہنا پڑے گا کہ ہےتو مجھے آنکھوں سے دکھایئے کہ کہاں ہے اوراگرآنکھوں سے نہ دکھا سکےتو غائب مانئے کیونکہ غائب وہ نہیں ہے جو ہوہی نہیں۔ غائب وہ نہیں ہے جوآنکھوں کے سامنے نہ ہو۔ غائب کی حقیقت ایک ثبوت اور ایک نفی سے بنتی ہے۔ موجود ہو اور آنکھوں کے سامنے نہ ہوتو ہو نانص رسولؐ صادق سے ثابت۔ سامنے نہ ہونا آنکھوں سے ثابت۔

اب غیب کا کونسا جزو محتاجِ ثبوت رہا؟ دنیا کہتی ہے کہ آخر غائب ہوئے ہی کیوں؟ میں کہتا ہوں کہ اسے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھئے کہ گیارہ کے ساتھ آپ نے کیاسلوک کیا جو اب پوچھ رہے ہیں کہ بارہویں کو غائب کیوں کیا؟ گیارہ آپ کے سامنے رہےلیکن کوئی بھی تو اپنی موت دنیا سے نہ گیا۔آپ نے کوشش کی کہ وہ سلسلہ ہی نہ رہےاوربس۔کیا کربلا میں کوئی کمی رہ

گئی تھی اس سلسلہ کو قطع کرنے کی۔ اس سلسلہ کو قطع کرنے کی کوئی کسر دنیا نے نہ اٹھا رکھی۔ وہ تو سیدِ سجادؑ پر خالق نے غشی کو طاری کر دیا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ غشی نہیں تھی، ایک پردۂ غیب تھا جو ان کی حفاظت کیلئے ان پر ڈالا گیا ورنہ یہ غش میں نہ ہوں اور پھر حسینؑ کی مدد نہ کریں تو ان کا کردار علی اکبرؑ کے کردار سے پیچھے رہ جائے گا۔ لہٰذا خالق نے غش کو ان پر طاری کر دیا۔ اپنی حکمتِ بلند کی بناء پر ورنہ میرا ایمان ہے کہ مرض ان کو کبھی بیہوش نہیں کر سکتا۔ نہ ہی مرض ہوش وحواس سلب کر سکتا ہے۔ یہ حکمتِ الٰہی تھی بقائے امامت کیلئے۔

مصائب

بس اربابِ عزا بس، چند مواقع ایسے ہیں جہاں غش سے افاقہ ہوا۔ پہلا موقع وہ ہے جب اُن کا غلام، غلام ترکی مولا کے پاس آیا کہ اب مجھے اجازت دیجئے۔ یہ غلام آپ نے سید سجاد علیہ السلام کی طرف منسوب کر دیا تھا، اس لئے فرمایا کہ تم مجھ سے کیوں اجازت مانگتے ہو، اپنے آقا سے اجازت مانگو؟ وہ دروازہ پر آتا ہے، بیبیاں جانتی ہیں کہ سید سجاد علیہ السلام غش میں ہیں، کوئی اہم بات ہے جو آیا ہے۔ موقع دیتی ہیں، غلام آتا ہے، ہوش میں لاتا ہے، کہتا ہے کہ مولاؑ! اجازت دیجئے کہ جا کر آپ کے بابا کی نصرت کروں۔ بس دیکھئے! عجیب کلمۂ حسرت، کہ اچھا بابا پر یہ وقت پڑ گیا کہ تمہاری مدد کی ضرورت ہے؟ اور اب ایک کلمہ حسرت فرماتے ہیں کہ ہم اگر اس لائق ہوتے تو بابا کی مدد کرتے؟ مگر ہم تو اس عالم میں ہیں، تم جاؤ میری طرف سے بابا کی مدد کرو۔ جو کہہ

رہا ہوں، اُس پر غور کیجئے۔ امام حسین علیہ السلام نے اس کو خیمے میں بھیج کر کتنی بلندی عطا کر دی، جب خیمے میں داخل ہوا تو غلام تھا، اب جو جا رہا ہے تو حقیقی معنوں میں نائبِ امام ہو کر جا رہا ہے۔ اتنی عزت افزائی بہت تھی، کہا: میرے سامنے خیمے کا گوشہ ہٹا دیا جائے کہ میں اپنے غلام کی جنگ دیکھوں۔ بس ادھر یہ غش میں گر گئے، اب وقت سخت سے سخت ہوتا جا رہا ہے۔ دوسری منزل عرض کروں کہ جب مولا نے صدا بلند کی:

"هَلْ مِنْ نَاصِرٍ يَنْصُرُنَا"

"کوئی ہے جو میری مدد کرے"۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مولا نے کئی دفعہ استغاثہ کیا ہے اور ہر استغاثے کا ایک خاص اثر ہوا ہے۔ یہ استغاثہ جو کیا ہے تو خود مولاؑ سمجھتے تھے کہ اس کا اثر کیا ہوگا اور ثبوت اس کا یہ ہے کہ استغاثہ میدان میں تھا اور نگاہ درِ خیمہ پر تھی۔ اس استغاثے کی خاصیت یہ تھی کہ آواز سید سجاد علیہ السلام کے کان میں گئی، آنکھ کھولی، کہا: پھوپھی جان! بابا فریاد کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے جنابِ زینبؑ رونے لگیں کہ ہاں، آواز تو انہی کی ہے۔ کہا: تو پھوپھی! میری تلوار لا یئے، یہ حکمِ امام ہے۔ اگر چہ پھوپھی ہیں، لاکر دے دیتی ہیں تلوار۔ اب مولاؑ وہاں سے دیکھتے ہیں اور پکار کر کہتے ہیں: زینب! سید سجادؑ کو آنے نہ دینا۔

میں کہتا ہوں کہ اب امامِ وقت کے حکم نے ان کے ہاتھوں میں طاقت پیدا کی کہ لے جا کر پھر بستر پر ڈال دیا۔ پھر غش آ گیا۔ اب تیسرا وقت

کونسا ہے جب مولا رخصتِ آخر کیلئے آئے ہیں، سب سے رخصت ہوئے، فرماتے ہیں کہ زین العابدینؑ کا کیا حال ہے؟ بی بی کہتی ہیں: کیا پوچھتے ہیں، دن بھر غش میں رہے ہیں۔ تشریف لائے، بیٹے نے آنکھ کھولی، تعظیم کیلئے کھڑا ہونا چاہا۔ مولاؑ نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا: نہیں، نہیں، اس وقت اُٹھو نہیں، بس جو میں کہتا ہوں، وہ سن لو۔ پورے قافلے کی ذمہ داری تم پر ہے۔ اب میں جارہا ہوں۔ اس کے بعد یہ الفاظ روایتوں میں آئے ہیں۔ اس کی حقیقت ہم کہاں سمجھ سکتے ہیں کہ اسرارِ امامت تعلیم فرمائے اور اس کے بعد تشریف لے گئے۔

بس اربابِ عزا! مجلس ختم۔ اب کب ہوش آیا، آندھیاں سیاہ چل چکیں، ہوش نہیں آیا۔ منادی نے ندا کی، ہوش نہیں آیا، خیموں میں آگ لگی، ہوش نہیں آیا۔ اب کب ہوش آیا؟ جب پھوپھی سرہانے کھڑی ہیں، کہا: اے بیٹا! خیموں میں آگ لگی ہے، اب تم امامِ وقت ہو، بتاؤ جل کر مرجائیں یا خیموں سے باہر نکلیں۔ اب سید سجاد علیہ السلام فرماتے ہیں: بس اب حکمِ خدا یہی ہے کہ خیموں سے باہر نکل جایئے۔ اربابِ عزا! اب وہ بیبیاں جن کی ماں کا جنازہ رات کو اُٹھا تھا، وہ روزِ روشن میں شہر بہ شہر۔

دوسری مجلس

- خدا کی قسم! یہ تو محمدؐ وآلِ محمدؑ کی زبان کا اعتبار ہے کہ جسے اللہ کا کلام کہہ دیا اُسے قرآن مان لیا جس کو اپنا کلام کہا اس کو حدیث سمجھ لیا۔
- ہمارے پیارے رسولؐ کی سیرت کے کتنے گوشے ہیں آپ پہلے ایک منبر پر تشریف لے جاتے آج ایک نیا منبر ہے جو ایک کھلے میدان میں رکھا گیا ہے پہلے منبر پر اکیلے تشریف لے جاتے تھے آج کسی کو منبر پر اپنے پاس بٹھا لیا۔
- اس وقت آپ نے فرمایا لوگو سنو اور غور سے سنو میں جس کا مولاؑ ہوں علیؑ اُس اُس کے مولاؑ ہیں۔
- فریضہ رسالت دو چیزوں سے ادا ہوتا ہے اقوال سے یا افعال سے اقوال کے لئے اطاعت واجب، افعال کے لئے اتباع واجب ہے۔
- یہ وقار خواتین کا تحفظ ہے جو ان کا عام لباس ہے اس لباس میں ان کا احرام صحیح ہے۔

اطاعت خداوندی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قُلۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوۡنِىۡ يُحۡبِبۡكُمُ اللّٰهُ وَيَغۡفِرۡ لَـكُمۡ ذُنُوۡبَكُمۡ‌ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ‏ ﴿۳۱﴾ [

کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہوتو میری پیروی کرو، اللہ بھی تمہیں دوست رکھے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا۔ وہ بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

پیغمبرؐ خدا سے ارشاد ہو رہا ہے کہ کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہوتو میری پیروی کرو، اللہ بھی تمہیں دوست رکھے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا۔ وہ بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

کل میں نے عرض کیا کہ پیغمبرؐ خدا کی اطاعت کا بھی حکم ہے اور اتباع کا بھی حکم ہے اور یہ عرض کیا کہ اطاعت ہوتی ہے اقوال کی اور اتباع ہوتا ہے افعال کا۔ اب سوال یہ ہے کہ اطاعت اور اتباع کا حکم کیا بس پیغمبرؐ خدا کے زمانہ کے مسلمانوں کیلئے تھا؟ انہی پر اطاعت کا فریضہ تھا اور انہی پر اتباع کا فریضہ عائد تھا؟ یہ تو اس وقت ہوتا جب پیغمبرؐ خدا کی رسالت اسی دورِ حیات

سے متعلق ہوتی۔تو بے شک اطاعت کا حکم بھی اسی وقت کے لوگوں کیلئے ہوتا اور اتباع کا حکم بھی اُسی دور کے لوگوں کے لئے ہوتا۔ پھر ہم اور آپ بالکل آزاد تھے، نہ ہمارے لئے اطاعت، نہ اتباع۔ پھر جتنے احکامِ شریعت ہیں، ان سب سے آزادی، اس لئے کہ تمام احکام شرع یا اطاعت کے ماتحت ہیں یا اتباع کے ماتحت ہیں۔ جب اطاعت واتباع اُسی دور کے لوگوں کیلئے ہے تو پھر ہمارے واسطے نہ کوئی واجب، نہ کوئی حرام۔تمام احکام ہم سے برطرف۔

لیکن یہ تو ہر مسلمان بلاتفریق فرقہ، اس کے نزدیک یہ تصور غلط ہے۔ آپ کی رسالت اس دورِحیات ہی سے متعلق نہ تھی اور جب اُسی دورِ حیات سے متعلق نہ تھی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ حکمِ اطاعت بھی تا قیامت ہے اور حکمِ اتباع بھی تا قیامت ہے۔

کل تفصیل سے بیان ہوا اور اس کا حوالہ میں نے دیا کہ اطاعت ہوتی ہے اقوال کی اور اتباع ہوتا ہے افعال کا۔ لہٰذا اقوالِ رسولؐ کو بھی تا قیامت محفوظ رہنا چاہئے اور افعالِ رسولؐ کو بھی تا قیامت محفوظ رہنا چاہئے کیونکہ اگر اقوال محفوظ نہ رہے تو اطاعت نہیں ہوسکتی اور اگر افعال محفوظ نہ رہے تو اتباع نہیں ہوسکتا۔

اب اقوال کیونکر محفوظ رہیں؟ وہ ہر ایک کو معلوم ہے کہ اقوال کی حفاظت کرتی ہیں کتابیں اور جب میں کہتا ہوں کہ کتابیں، تو سرفہرست ہے کتاب اللہ کوئی کہے کہ بات تو اقوالِ رسولؐ کی تھی۔ یہ سرفہرست کتاب اللہ کیونکر ہوگئی؟

میں کہوں گا کہ میں نے بھولے سے نہیں کہا ہے، سمجھ بوجھ کر کہا ہے، میرا بھی ایمان ہے کہ یہ کتاب اللہ ہے مگر جسے ہم اور آپ اور ہر مسلمان کتاب اللہ کہتا ہے، سمجھتا ہے اور مانتا ہے، اس کو لوحِ محفوظ سے اُترتے ہم نے نہیں دیکھا۔ ہم نے تو قرآن کو بھی اسی زبان سے سنا جس زبان سے حدیثوں کو سنا۔ ارے! ہم نے تو کچھ بھی نہیں سنا۔ جس جس نے سنا، قرآن کو بھی اُسی زبان سے سنا جس زبان سے حدیثوں کو سنا۔ خدا کی قسم! یہ تو اُن کی زبان کا اعتبار ہے جسے اللہ کا کلام کہہ دیا، اُسے قرآن مان لیا، جس کو اپنا کلام کہا، اُس کو حدیث سمجھ لیا۔

ورنہ ہم کیا جانتے کہ کون کلام اللہ اور کون اُنؐ کا اپنا کلام۔ اب یہ سیرت سے متعلق بات ہے، میں کہتا ہوں، بخدا! یہ بھی امانتداری تھی ان کی کہ زبان پر ان کی کلام آ رہا تھا اور کہہ رہے تھے کہ میرا نہیں ہے، اسی زبان پر قرآن آیا، اسی زبان پر حدیثیں آئیں۔ جسے انہوں نے کلام اللہ کے طور پر پیش کیا یہ کہہ کر کہ یہ کلام اللہ ہے، اسے ہم نے قرآن مانا، جسے اپنا کلام کہہ کر پیش کیا، اسے حدیث مانا۔

اسی لئے یہ ایک جملہ ہے، اسے چاہے محفوظ کر لیجئے اور بوقتِ فرصت اس پر غور کیجئے گا کہ یہ صحیح ہے یا نہیں۔ میں کہہ رہا ہوں کہ جب تک ان کی زبان پر اعتبار نہ ہو، قرآن پر ایمان ہو ہی نہیں سکتا۔ تو قرآن مجید ہو یا کتبِ حدیث، یہ سب مجموعہ ہیں ان اقوال کا جو حضرتؐ کی زبان مبارک پر آئے۔ جو اقوال بحیثیت کلام اللہ آئے، انکا مجموعہ قرآن مجید، جو بحیثیت اپنے کلام کے آئے، اُن کا مجموعہ کتبِ احادیث ہیں۔

تو یہ کتب تو اقوال کی حفاظت کا ذریعہ ہیں۔ افعالِ رسولؐ کیونکر محفوظ رہیں؟ رواروی میں کوئی شخص جواب دے گا کہ افعالِ رسولؐ بھی راوی بیان کریں اور وہ کتابوں میں درج ہوجائیں، اس طرح افعالِ رسولؐ بھی محفوظ ہوجائیں گے۔ مگر ذراسی باریک بات ہے، اربابِ فہم مجمع میں ہیں، انشاءاللہ کسی کو کوئی دشواری نہیں ہوگی کہ فعلِ رسولؐ راوی کی زبان پر آیا تو قول ہو گیا، فعل نہیں رہا۔ فعل تو اُسی وقت تک فعل ہے جب تک فاعل سے ہے اور جب اس کا بیان کسی سے ہوا تو وہ قول ہوا، فعل نہیں رہا۔ یوں تو کسی اور راوی کا کیا ذکر، قرآن مجید میں حضرت ابراہیمؑ کے اقوال بھی موجود ہیں، حضرت نوحؑ ،حضرت عیسیٰؑ ،حضرت موسیٰؑ، سب کے اقوال بھی ہیں، افعال بھی ہیں۔ قرآن مجید نے بیان کیے ہیں۔ تو کیا ان سب انبیاء کے افعال ہم تک پہنچے؟ افعال نہیں پہنچے، ان کا بیان ہے جو بذریعہ قرآن ہم تک پہنچا ہے۔ اسی طرح اگر حضرتؐ کے افعال کو راویوں نے بیان کیا تو یہ اُن کا بیان ہے جو ہم تک پہنچا، افعالِ رسولؐ کہاں پہنچے ہیں؟

یاد رکھئے! کتاب فعل کو کبھی نہیں دکھاتی، فعل کو آئینہ دکھایا کرتا ہے۔ میرا ہاتھ جنبش کرے گا، آئینے میں نظر آئے گا۔ بے شک آپ فعل کو دیکھ رہے ہیں۔ میرا ہاتھ ساکن ہوگا، آئینے میں نظر آئے گا۔ بے شک آپ فعل کو دیکھ رہے ہیں۔ لیکن ان دنیا والے آئینوں میں ایک بڑی خرابی ہے اور وہ خرابی یہ ہے کہ اس میں عکس اُسی وقت تک نظر آتا ہے، جب تک اصل سامنے رہے۔ اِدھر اصل نظر سے اوجھل ہوا اور عکس بھی غائب ہوا۔ ہمیں ایسے آئینے نہیں چاہیئیں، ہمیں ایسے آئینے چاہیئیں کہ پیغمبرؐ خدا تشریف لے جائیں اور

افعالِ پیغمبرؐ خدا ہمیں نظر آتے رہیں۔

ایک اور نقص اس آئینہ میں ہے کہ یہ آئینہ اسی عمل کو دکھائے گا جو وقوع میں آ گیا۔ میں نے عرض کیا کہ میں نے حرکت کی ہاتھ سے اور وہ آئینہ میں نظر آ گئی۔ ہاتھ کو ساکن کیا، وہ سکون آئینہ میں نظر آ گیا۔ جو کام وقوع میں آ جائے، وہ نظر آئے گا مگر افعالِ رسولؐ بمقتضائے اسباب ہوتے تھے۔ جیسا سبب جس وقت ہوا، ویسا عمل وقوع میں آیا۔ جب تک وہ سبب پیدا نہ ہوگا، اُس وقت تک رسولؐ کا وہ عمل نہ ہوگا ورنہ خلافِ عقل ہوگا، خلافِ حکمت ہوگا۔

مثال کے طور پر کوئی مسلمان پیغمبرؐ خدا کے ساتھ ابتدائے بعثت سے ہجرت تک جو تیرہ برس کی مدت ہے، یعنی دورِ رسالت کا آدھے سے زیادہ حصہ، کیونکہ 23 میں سے 13 آدھے سے زیادہ ہیں۔ 10 آدھے سے کم ہے۔ تو تیرہ برس پیغمبرؐ خدا کے ساتھ رہتا اور کسی وقت جدا نہ ہوتا، ایسا خاص صحابی ہوتا کہ کسی وقت جدا نہ ہوتا اور وہ قسمیں کھا کر کہہ سکتا کہ میں ہر وقت رسولؐ کے ساتھ رہا، تیرہ برس مسلسل، کسی وقت میں نے آپؐ کا ساتھ نہ چھوڑا، آپؐ کی سیرتِ حیات میں تلوار اُٹھانا نہیں ہے۔

اُس کا یہ بیان بالکل صحیح ہوگا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں سیرتِ رسولؐ کے دائرہ میں تلوار اُٹھانا نہیں ہے۔ اب اس میں سے کوئی نتیجہ نکالے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے رسولِؐ مطلق عدم تشدد کے قائل ہیں۔ جیسا کہ دنیا کے بعض رہنماؤں کا اصول ہے لیکن اب جب ہجرت کر کے آپؐ مدینہ تشریف لائے تو اب اس کے بعد ایک سال اسی میں شامل کیجئے، اب ہو گئے چودہ برس۔

2ھ میں دیکھئے، بدر دیکھئے، اُحد دیکھئے، خندق دیکھئے، خیبر دیکھئے تو تلوار نظر آئے گی ان کے ہاتھ میں۔ ظاہر نہ سہی مگر کسی ایسے ہاتھ میں جو انہی کا ہاتھ ہے۔ بہرحال اب تلوار ہے۔ تو معلوم ہوا کہ سیرتِ رسولؐ کا ایک گوشہ تھا جو چودہ برس تک پردے میں رہا اور جب وہ اسباب ہوئے، تب وہ سیرت کا گوشہ سامنے آیا۔ یہ مسلمان جو سیرتِ نبویؐ مرتب کر رہا تھا، اس نے اب تک ایک سطر کا اضافہ کیا کہ ہاں ان کی سیرت میں تلوار اٹھانا بھی ہوتا ہے۔ اب اسی مسلمان سے پوچھئے کہ جن سے جنگ ہو رہی ہے، کیا پیغمبرؐ اِن سے کبھی صلح بھی فرمائیں گے؟

یاد رکھیے جتنا اُسے بظاہر جوشِ ایمانی زیادہ ہوگا اور جتنا ایمان کی شدت کا زعم زیادہ ہوگا، اُتنی شدت سے وہ انکار کرے گا۔ توبہ توبہ، بھلا رسولؐ اور مشرکین سے صلح فرمائیں؟ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ارے! وقوع میں آ جانے کے بعد جب بہت سے مسلمانوں کے حلق سے یہ چیز نہ اُترتی ہو تو پہلے کیونکر تصور میں آ سکتا تھا کہ یہ صلح بھی فرمائیں گے مشرکین کے ساتھ۔

لیکن اب آنے دیجئے 6ھ اور حدیبیہ کی منزل اور دیکھئے کہ پیغمبرؐ خدا صلح کر کے واپس تشریف لے جاتے ہیں مکہ سے یا نہیں؟ اب اس نے کہا کہ ہاں صاحب! بے شک سیرتِ نبوی میں صلح کرنا بھی ہے۔ اب حساب لگائیے کہ تیرہ برس وہ قبل ہجرت اور 6ھ میں یہ واقعہ، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ بعد بعثت 19 برس تک سیرت کا یہ گوشہ پردہ میں رہا اور سامنے نہیں آیا کیونکہ وہ اسباب نہیں ہوئے تھے جن اسباب سے سیرت کے عمل کا تعلق تھا۔

اب اسی مسلمان سے یہ پوچھئے یا اور مسلمانوں سے جو اس کے ساتھ

ہوں کہ خیر صلح ہو گئی، اب اگر یہ لوگ عہد شکنی کریں اور شرائطِ صلح کی خلاف ورزی کریں اور رسولؐ فاتحانہ طور پر مکہ میں داخل ہوتو ان لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟ اب پھر وہی بات کہ جتنا اپنے ایمان کا دعویٰ زیادہ ہوگا، اُتنی شدت کے ساتھ سزا تجویز کرے گا۔ اب جتنے الفاظ آپ کے نزدیک لغت میں زیادہ سخت ہوں۔

ارے! پرخچے اُڑا دیں گے، پرزے پرزے کر دیں گے ان کم بختوں کے۔ یہی سب وہ کہتا اور اُسے تقاضائے ایمان سمجھتا لیکن اب آنے دیجئے 8 ھ میں فتح مکہ اور دیکھئے کہ رسولؐ کے سامنے وہی جماعت ہے اور پیغمبرؐخدا ان کے ساتھ کیا رویہ اختیار فرماتے ہیں۔

تو سیرت کا نیا باب سامنے آیا یا نہیں؟ اب اسی مسلمان سے پوچھئے کہ پیغمبرؐخدا اپنے مخالفین سے تلوار کے علاوہ کسی اور طریقے سے بھی جنگ کرتے ہیں؟ تو وہ کہے گا کہ یہ تو ہماری سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ جنگ ہو اور تلوار کے بغیر ہو۔ لیکن آنے دیجئے 9 ھ میں مباہلے کا میدان کہ جنگ بھی ہو رہی ہے اور تلوار کہیں نہیں ہے۔

اب معلوم ہوا کہ سیرت کا ایک باب آج سامنے آیا 9 ھ اور 9 ھ کے بعد 10 ھ۔ اس مسلمان سے پوچھئے کہ اگر پیغمبرؐخدا کو کوئی مجمع ایسا ملے کہ اتنا بڑا مجمع نہ اس سے پہلے رسولؐ کے سامنے ہوا ہو، نہ اس کے بعد کبھی ہوگا۔ اتنا بڑا مجمع ہو، ایک لاکھ کے قریب مسلمان رسولؐ کے سامنے ہوں تو اس موقع پر پیغمبرؐخدا کیا فرمائیں گے؟

یہ کہے گا کہ وہی فرمائیں گے جو عمر بھر فرماتے رہے، نماز پڑھو، روزے رکھو، حج کرو، زکوٰۃ دو۔ جو ہمیشہ کہتے رہے، وہی وہاں بھی کہیں گے۔ مگر اب آنے دیجئے 10 ھ میں، وہ بھی آخری مہینہ، ذی الحجہ کا مہینہ اوراس کی اٹھارہ تاریخ۔ اس میں رسولؐ کی سیرت کے کتنے گوشے ہیں؟ ہمیشہ دیکھتے تھے وہ منبر، آج نیا منبر دیکھا۔ ہمیشہ دیکھتے تھے مسجد میں آج کھلا میدان دیکھا۔ اس کے بعد رسولؐ منبر پر تشریف لے گئے۔ اس کے بعد ایک نئی بات دیکھی کہ ہمیشہ منبر پر اکیلے جاتے تھے، آج کسی کو اپنے پاس بٹھالیا اوراب نفسیاتی طریقہ پر دیکھئے کہ یہ نئی بات جو ہو رہی ہے، تو اب مجمع جو ہے، وہ خطبے کے الفاظ کم سن رہا ہے اور یہ صورت زیادہ دیکھ رہا ہے۔

یہاں چند جملے ہیں، یہ یہاں کیسے؟ ذہنوں میں تصورات تہہ و بالا ہیں کہ کوئی خاص بات ہے۔ یعنی پورا جملہ ہوا میں جا رہا ہے۔ آخری جملہ کا انتظار ابھی سے ہے۔

تو جناب! یہ سب باتیں آج نئی نظر آرہی ہیں۔ اس کے بعد پورا خطبہ ہو جاتا ہے جو لوگوں نے غور سے نہیں سنا ہے۔ اسی لئے تمام مسلمانوں کی تاریخیں دیکھ لیجئے تو وہ پورا خطبہ کہیں ملتا بھی نہیں۔ سنا کس نے تھا غور سے؟

اب وہ وقت آیا جس کیلئے پاس بٹھایا تھا۔ تب پیغمبرؐ نے وہ تاریخی الفاظ فرمائے۔

"مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا عَلِيٌّ مَوْلَاهُ۔"

’’جس کا میں مولا ہوں، اُس کا یہ علیؑ بھی مولا ہے۔‘‘

ماشاءاللہ! صاحبانِ فہم بھی ہیں، تو جنابِ والا!

’’فَھٰذَا عَلِیٌّ مَوْلَاہُ‘‘۔

عربی میں تعیین کیلئے اُن میں سے ہر لفظ کافی ہے۔ اشارہ کر دیا تو یقین فردِ واحد کا ہوگیا اور نام لے دیا تو تعیین شخص واحد کی ہوگئی۔ رسولؐ نے دو طریقے صرف کر دیئے۔ فَھٰذا بھی، علیؑ بھی۔ معنی یہ ہیں کہ اگر حاضر ہوں تو یہ دیکھو اور غائب ہوں تو نام سنو۔

پیغمبرؐ خدا کی سیرت کا نیا باب سامنے آیا یا نہیں؟ اس کے بعد مدینہ منورہ واپس ہوئے تو علیل ہوگئے۔ دو مہینے کے بعد وفات ہوگئی۔ تو اب پیغمبرؐ خدا کی سیرت کی وفات طیبہ کا جو سال آیا، وہ سیرت کا ایک نیا باب کھولتا ہوا آیا۔ اب جو کتابِ سیرت اپنے عمل سے مرتب کر رہا تھا، اس میں برابر اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ شخصیت وفات کے ذریعہ سے ہمارے سامنے سے ہٹ گئی، چلی گئی اور رسالت ہے تا قیامت۔

تاریخ کے طالب علم بھی یہاں ہوں گے۔ تاریخ کا مسلمہ اصول ہے کہ تاریخ رواں دواں رہتی ہے، وہ ایک نقطہ پر نہیں پڑتی۔ گونا گوں حالات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

تو حضورِ والا! کیا تاریخ کا یہ اصول یہاں ٹوٹ گیا؟ یعنی اب 11ھ سے لے کر قیامت تک تاریخ کی سوئی ایک نقطہ پر منجمد ہوگئی کہ ابھی تک تو ہر سال

نئے نئے حالات پیدا ہو رہے تھے اور اب کوئی نئی صورتِ حال پیدا نہیں ہوگی؟ یہ خلافِ عقل بات ہے۔ یقیناً زندگی کے کتنے دوراہے ایسے ہوں گے کہ پیغمبرؐ خدا کے اُس دورِ حیات میں پیش نہیں آئے تو اس دورِ حیات میں پیغمبر کا عمل کیا ہوتا؟ وہ پردہ میں رہ گیا۔ لہٰذا اب ہمیں وہ آئینے نہیں چاہیئیں جو وقوع میں آئے ہوئے افعالِ رسولؐ کو دکھائیں۔ ہمیں وہ آئینے چاہیئیں جو ملکاتِ نفس پیغمبرؐ خدا کو جذب کر لیں۔

ماشاء اللہ لاہور کی سرزمین ہے اور یہاں علمی ذوق بلند پایہ ہے۔ مگر پھر بھی میں محسوس کرتا ہوں کہ بہت سے لوگوں کیلئے یہ الفاظ قابلِ فہم نہیں ہیں۔ ایک بات توجہ سے سن لیجئے۔ جو ہر وقت ہوتا ہے اور وہ طاقت جو فعل کو کرواتی ہے، اُسے مَلکہ کہتے ہیں۔ یعنی پردۂ شب میں جس نے نفس سے اس فعل کو کروایا، یہ فعلِ سخاوت ہے اور خود سخاوت ملکہ ہے جس نے نفس سے اس فعل کو کروایا۔ بروقت وہ کام ہے جو منتظر سبب رہتا ہے اور ملکہ نفس کی وہ طاقت ہے جو قائم ہوتی ہے، راسخ ہوتی ہے اور بروقت اس عمل کو کرواتی ہے۔

تو اب یہ جملہ غالباً سمجھ میں آ گیا ہوگا۔ ہمیں وہ آئینے نہیں چاہیئیں جو افعالِ رسولؐ کو دکھائیں بلکہ ہمیں وہ آئینے چاہیئیں جو ملکات نفس رسولؐ کو جذب کر لیں۔ اُردو زبان میں اس کو میں کہہ سکتا ہوں کہ ہمیں وہ آئینے نہیں چاہیئیں جو یہ دکھائیں کہ رسولؐ نے کیا کیا؟ ہمیں وہ آئینے چاہیئیں جو یہ دکھائیں کہ رسولؐ ہوتے تو کیا کرتے! وہ آئینے ہمارے لئے مفید نہیں ہیں جو یہ دکھائیں کہ رسولؐ نے کیا کیا کیا۔ ہمیں وہ آئینے درکار ہیں جو یہ دکھائیں کہ پیغمبرؐ ہوتے تو کیا

کرتے! اس کیلئے خالق نے اپنے رسولؐ کو آئینے عطا فرمائے۔ اگر یہ آئینے دور دور کے ہوتے تو کسی وقت کا عکس لیتے اور کسی وقت کا عکس نہ لیتے۔ لہٰذا حکمتِ الٰہی اس کی متقاضی ہوئی کہ یہ آئینے رسولؐ کی گود میں رکھ دیئے جائیں تاکہ ملکاتِ نفس پیغمبر خدا کو جذب کر لیں۔

کیا کہنا ان آئینوں کا! جو ہر رکھے ہوئے اللہ کے، جلا دی ہوئی تربیتِ رسولؐ کی۔ گویا پیغمبرؐ خدا کا کاشانہ آئینہ خانہ بنا ہوا تھا۔ بیچ میں پیغمبرؐ، چار طرف چار آئینے۔

حدیثیں جتنی پڑھوں گا، وہ متفق علیہ ہوں گی۔ ایک آئینہ قدِ آدم، تقریباً برابر کا۔ پیغمبرؐ نے اپنا عکس دیکھا، بالکل مکمل نظر آیا۔

"عَلِیٌّ مِنِّیْ وَاَنَا مِنْہُ"۔

''یہ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں۔''

"عَلِیٌّ مِنِّیْ وَاَنَا مِنْہُ۔"

خالق نے فرمایا: ''اَنْفُسَنَا''

یہ تو ہمارا نفس ہے اور ابھی میں فعل اور ملکہ کا فرق بتا چکا۔ یاد رکھیئے کہ افعال کا مرکز اعضاء ہوتے ہیں اور مَلِکہ کا مرکز نفس ہوتا ہے۔ جہاں ایک الفاظ کی منزل ہے، فعل جدا، فاعل جدا۔ اٹھانا ہاتھ کا کام، پیروں سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ کہنا زبان کا کام، ہاتھوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ چلنا پھرنا پیروں کا کام ہے، کانوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ سننا کانوں کا کام،

زبان سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ افعال کی منزل میں فعل الگ، فاعل الگ مگر نفس کی منزل میں سب افعال ایک۔

دیکھا آنکھوں نے، آپ نے کہا: میں نے دیکھا۔ اُٹھایا ہاتھوں نے، آپ نے کہا: میں نے اُٹھایا۔ راستہ طے کیا پیروں نے، آپ نے کہا: میں نے راستہ طے کیا۔ سنا کانوں نے، آپ نے کہا: میں نے سنا۔ سب افعال ایک کے ہو گئے۔ جب تک لسان اللہ کہا، زبان کی گفتگو اپنی ہوئی۔ جب تک اذن اللہ کہا، سماعت اپنی ہوئی۔ جب تک جنب اللہ کہا، پناہ دینا اپنا ہوا۔ لیکن جب نفس کہہ دیا تو افعال ان کے نہیں رہے، خدا کے ہو گئے۔

دوسرا آئینہ نسبتاً چھوٹا مگر اپنے شعبہ میں مکمل۔ پیغمبرؐ نے سند عطا فرمائی، مسلم الثبوت، صحیح بخاری ہے، بنظر اختصار، فاطمہؑ کے فضائل میں صرف تین عدد احادیث، اس میں سے ایک یہ ہے کہ:

"فَاطِمَةُ بَضْعَةٌ مِنِّیْ"

''فاطمہؑ میرا ٹکڑا ہے۔''

میرا ایک جزو ہے۔ حضورِ والا! جزو کون ہوتا ہے؟ جزو وہ ہوتا ہے جسے نکال لیجئے تو چیز نامکمل ہو جائے۔ ملا دیجئے تو اس کی تکمیل ہو جائے۔ یہ سندِ خاص فاطمہؑ کیلئے ہے۔ حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کیلئے بھی نہیں ہے۔ حسنؑ وحسینؑ کیلئے بھی نہیں ہے۔ صرف حضرتِ فاطمہؑ زہرا کیلئے یہ الفاظ ہیں۔ ''بضعةُ مِنّیْ'' میرا ایک جزو۔

میں کہتا ہوں، میرے گزشتہ بیان کی روشنی میں اس جزو کی حقیقت پر غور کیجئے کہ کیا رسالتِ پیغمبرؐ صرف مردوں کیلئے ہے؟ وہ تو تمام نوع بشر کیلئے ہے۔ اس میں مرد بھی ہیں، عورتیں بھی ہیں۔ اور میں نے کہا کہ فریضہ رسالت دو چیزوں سے ادا ہوتا ہے، اقوال سے اور افعال سے۔ اقوال کیلئے اطاعت واجب اور افعال کیلئے اتباع واجب۔ اقوالِ رسولؐ تو سب کیلئے ہو سکتے ہیں، مرد اور عورت دونوں کیلئے۔ افعال رسولؐ دونوں کیلئے نہیں ہو سکتے، چاہے موجودہ ترقی پسند زمانہ کتنا ہی کہے کہ ہر میدان میں مرد وعورت دوش بدوش مگر میں کیا کروں، اسلام میں تو نماز تک میں دوش بدوش نہیں، حالانکہ نماز کوئی معاشرتی چیز نہیں، وہ تو ما بین خدا وخود ایک عبادت ہے۔

مگر اس میں بھی مرد کی نماز اور طرح اور عورت کی نماز اور طرح۔ ہمارے ہاں دینیات کی کتاب مولوی فرمان علی صاحب مرحوم کی ایک وقت میں رائج تھی، بچوں کو پڑھائی جاتی تھی۔ مردوں کیلئے کچھ نمازیں جہری، کچھ اخفات کے ساتھ۔ لیکن عورت کیلئے جو نمازیں جہری بھی ہیں، وہ بھی اخفات کے ساتھ یعنی آہستہ۔

اب ماشاءاللہ آپ صاحبانِ فہم ونظر ہیں، ذرا غور کیجئے کہ نماز میں بڑی ضرورت ہے رجوعِ قلب کی اور رجوع قلب کا انتہائی درجہ ہے محویت۔ اس کا معیار اور کمال آپ نے سنا ہوگا کہ تیر کھینچ لیا جاتا ہے اور پتہ نہیں ہوتا۔ یہ محویت کا عالم، یہ استغراق کا عالم۔ اور یہ روح ہے نماز کی مگر اب میں اہلِ فہم سے، اہلِ عقل سے، صاحبانِ علم ونظر سے، سب سے پوچھتا ہوں کہ

اگر آدمی میں ایسی محویت ہوئی کہ مرد اپنا مرد ہونا بھول گیا، عورت اپنا عورت ہونا بھول گئی تو احکام شریعت پر عمل ہی کیونکر ہوسکتا ہے؟ معلوم ہوا کہ خالق کی نظر میں جتنی اہمیت نماز میں استغراق کو ہے، اُتنی ہی خصوصیت اس کی نگاہ میں ہے اپنی خصوصیتِ صنفی کے باقی رکھنے کی کہ مرد یاد رکھے کہ میں مرد ہوں اور عورت یاد رکھے کہ میں عورت ہوں۔

تو پھر کیا مشکل ہے کہ نماز میں یاد رکھے اور زندگی کے سب کاموں میں بھول جائے۔ اس کے بعد لباس نماز میں زمین آسمان کا فرق۔ مرد کیلئے اتنا لباس کہ جس کے بغیر نماز باطل ہوگی۔ بہت مختصر، بس اتنا کہ برہنہ نہ ہو اور عورت کیلئے سوا چہرے کے، گٹوں سے لے کر انگلیوں تک اور ہاتھوں کے باقی تمام اجزاء پوشیدہ ہوں۔ صحتِ نماز کیلئے ضروری۔

کتنی ہی ترقی یافتہ خاتون کیوں نہ ہو، لیکن اگر نماز پڑھتی ہو تو اس وقت یہی لباس اختیار کرنا ہوگا اور اب ایک پہلو کی طرف توجہ دلاؤں اور صاحبانِ علم کیلئے بعد میں توضیح ہوگی۔ یہ نامحرم کی وجہ سے نہیں ہے۔ اپنے مکان میں، پردۂ شب میں، گھر کے دروازے بند کر کے، سامنے پردے ڈال کر بھی نماز ہو تو اس سے زیادہ کوئی جزوِ جسم کا بے پردہ ہو تو نماز باطل ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اس سے خالق کا منشاء سمجھئے کہ جو خالق اپنی بارگاہ میں عورت کو بے پردہ دیکھنا نہ چاہتا ہو، وہ بھلا اسے کیسے پسند کرے گا کہ بوالہوس مردوں کے سامنے وہ بے پردہ پھرے۔ ترقی پسند لوگوں نے عورتوں کو یہ درس دیا ہے کہ دیکھو! اسلام نے عورتوں کو مصیبت میں ڈالا ہے، مردوں کو آزادی

دی ہوئی ہے۔ حج پر جا کر دیکھئے کہ مردوں کیلئے مصیبت ہے یا عورتوں کیلئے۔ مرد ذرا سا بھی سایہ سر پر نہیں رکھ سکتے اور وہ اطمینان سے اپنے سر پر چادریں تانے ہوئے۔ مرد ایسا لباس خاص اختیار کریں کہ جس سے مردہ اور زندہ میں بہت کم فرق محسوس ہوتا ہے۔ ہمارے لئے ضرورت ہے کہ ایسا لباس ہو اور عورتوں کیلئے جو عام لباس ان کا ہے۔

یہ وقار خواتین کا تحفظ ہے جو ان کا عام لباس ہے، اُسی لباس میں ان کا احرام صحیح ہے۔ ان کیلئے یہ شرط نہیں ہے اور عام احکام میں ان کیلئے کتنی آزادیاں ہیں، ہمارے لئے کتنی مصیبت ہے۔ ہم ایک چھلا سونے کا نہیں پہن سکتے، وہ بقدرِ برداشت پہن سکتی ہیں۔ ہم خاص لباس بھی ریشم کا نہیں پہن سکتے، وہ سر سے پاؤں تک ریشمی لباس پہنیں، کوئی مضائقہ نہیں۔

یہ کیا ہے؟ یہ حقیقت میں خالق کی طرف سے صرف احساس باقی رکھنا اور پھر ان کے وقار کا تحفظ ہے، ان کی عزت و ناموس کا تحفظ ہے۔ یہ تمام مقاصد ہیں، ورنہ اسے ہم کو مصیبت میں ڈالنا نہیں ہے اور نہ انہیں آرام پہنچانا ہے۔ یہ تو جب ہوتا ہے کہ جب ان کا کوئی رشتہ اُس سے زیادہ ہوتا، ہم سے کم ہوتا۔

خالق کے نہ تو بیٹا ہے، نہ بیٹی ہے۔ خواتین کو ایک حقیقت کی طرف متوجہ کروں گا کہ جس رسولؐ کی زبان سے یہ احکام پہنچے ہیں، اُسے اللہ نے بیٹا نہیں عطا کیا، بیٹی ہی عطا فرمائی ہے۔ ہم تو ان کے ہر حکم کو حکمِ الٰہی سمجھتے ہیں۔ لیکن جو شخص رسالت کا منکر ہو، وہ بھی ان کے قانون میں یہ تصور نہیں کر سکتا کہ

عورتوں کے لئے ناانصافی ہوئی ہوگی اور مردوں کو کچھ ان کے حق سے زیادہ دے دیا ہوگا۔

تو اب وہی بات آگئی کہ جب احکام شریعت کے الگ الگ، حج کا طریقہ الگ الگ، نماز کا طریقہ الگ الگ اور جانے کتنی باتوں میں الگ الگ تو رسولؐ کا عمل مردوں کیلئے تو نمونہ ہوسکتا ہے، عورتوں کیلئے نمونہ نہیں بن سکتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ عورتوں پر حجتِ خدا تمام ہی نہیں ہوتی اور مقصدِ رسالت ہے حجت تمام کرنا۔

قرآن کہہ رہا ہے:

"رُسُلاً مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ"۔

پیغمبر اس لئے بھیجے گئے ہیں کہ خلقِ خدا کے پاس پیغمبروں کے آجانے کے بعد کوئی عذر نہ ہو، اپنی کوتاہی روزِ قیامت پیش کرنے کیلئے۔ تو اگر فقط رسولؐ کی ذات ہو تو عورتیں بارگاہِ خداوندی میں روزِ قیامت کہہ سکتی ہیں کہ بارِ الٰہا! ہم اگر ایمان وعمل میں ناقص رہے تو ہمارا قصور نہیں ہے، ہماری ہدایت ہی پوری نہیں ہوئی، اس لئے کہ مردوں کیلئے تو اقوال بھی رہے اور افعال بھی رہے اور ہمارے لئے تو بس اقوال ہی اقوال رہے۔ عمل کا کوئی بے داغ نمونہ ہمارے سامنے آیا ہی نہیں۔ تو جب حجت تمام نہیں ہوئی تو مقصدِ رسالت کی تکمیل نہیں ہوئی۔

اس لئے ضرورت تھی کہ پیغمبرؐ کے خزانۂ رسالت میں کوئی گوہر بے بہا ایسا ہو کہ اس کا کردار عورتوں کیلئے ویسا ہی معصوم نمونۂ عمل ہو جیسا خود رسولؐ کا کردار مردوں کیلئے نمونۂ عمل ہے۔ اس کیلئے خالق نے اپنے رسولؐ کو حضرتِ فاطمہ سلام اللہ علیہا جیسی بیٹی کرامت فرمائی۔ اس معنی سے پیغمبرؐ نے فرمایا ہے کہ فاطمہؑ میرا ایک جزو ہے۔ یعنی اگر فاطمہؑ نہ ہوں تو میرے فرائض کی تکمیل نہیں ہوتی۔ فاطمہؑ میرے ساتھ مل جائیں تو میرے فرائض رسالت مکمل ہوتے ہیں، بغیر انؑ کے میرے مقصدِ رسالت کی تکمیل نہیں ہوتی۔

اب معلوم ہوا کہ یہ فاطمہؑ تھیں جو حضرت پیغمبرؐ خدا تعظیم کو کھڑے ہوتے تھے۔ بیٹی ہونے کا تقاضا ہی نہیں ہے کہ باپ تعظیم کو کھڑا ہو، یہ عمل خود بتاتا ہے کہ فاطمہؑ صرف بیٹی ہی نہیں ہیں بلکہ کچھ اور بھی ہیں۔ تو یہ فاطمہؑ کی تعظیم نہیں ہے۔ اس منصب کی تعظیم ہے جو جنابِ فاطمہؑ کے سپرد ہے۔

اس سے ایک مشکل میری حل ہو جاتی ہے، اپنی کوتاہی معلومات کے اقرار کے ساتھ یہی عرض کروں گا کہ میری کوتاہ نظری ہے کہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی وسیع النظر ہو، اس کے سامنے کوئی مآخذ ہو جس کے فضائل بے شمار، جس کے فضائل کی کوئی انتہا نہیں۔ مگر مجھے حضرت علی علیہ السلام کیلئے نہیں ملتا کہ پیغمبرؐ خدا تعظیم کو کھڑے ہوتے ہوں۔ یہ مشکل نہیں ہے یا نہیں؟ اب جو حل اس کا میری سمجھ میں آتا ہے، میری سمجھ جو آیا، وہ یہ کہ فضائل کا بے شمار ہونا اور بات ہے مگر علیؑ کا جو منصب ہے، وہ بعدِ رسولؐ ہوگا، فاطمہؑ کا جو منصب ہے، وہ حیاتِ رسولؐ میں ہے۔

اب جناب دو آئینے ہو گئے۔ ایک آئینہ قدِ آدم، دوسرا آئینہ میں نے کہا کہ اپنے شعبہ میں مکمل۔ اب دو چھوٹے چھوٹے آئینے، مگر جناب آئینے میں ایک خصوصیت ہے، وہ تو اُس آئینے میں بھی ہے جسے میں بیکار کہہ چکا ہوں۔ جسے میں نے کہا کہ مجھے کوئی فائدہ نہیں مگر وہ خصوصیت اس آئینہ میں بھی ہے کہ آئینہ خواہ چھوٹا ہو مگر تصویر پوری دکھاتا ہے بلکہ آئینہ کے اگر ٹکڑے بھی ہو جائیں تو ہر ٹکڑا آئینہ ہوگا۔

ان چھوٹے چھوٹے آئینوں کیلئے میں کہتا ہوں کہ پیغمبرؐ نے ان میں جھک کر اپنا نقشہ دیکھا، تصویر مکمل نظر آئی۔ سند عطا فرما دی ایک۔ دونوں کو مشترک:

"اَبْنَایَ ھٰذَانِ اِمَامَانِ قَامَا اَوْ قَعَدَا"۔

''میرے یہ دونوں بیٹے امام ہیں، چاہے کھڑے ہوں، چاہے بیٹھے ہوں۔''

یہ امام کہنے پر قرآن مجید کے ماننے والوں کو تو تعجب نہیں ہونا چاہئے۔ قرآن نے بتایا کہ گھوارہ کا بچہ کہہ رہا ہے:

اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ ۛ اٰتٰنِیَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا ﴿۳۰﴾

''میں اللہ کا بندہ ہوں، اُس نے کتاب عطا کی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے۔''

صیغہ ماضی ہے۔ تو اب جمہورِ ملت کی زبان میں بات کرتا ہوں کہ اگر اُممِ سابقہ میں گھوار کا بچہ نبی ہو سکتا ہے تو افضل الامم میں چار یا پانچ برس کے

بچے امام کیوں نہیں ہو سکتے ؟

اس لئے امام کہنے میں اور سمجھنے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوتی ۔ اس میں کوئی مشکل درپیش نہیں آتی ۔ لیکن ہاں ! یہ آخر کا جملہ کہ یہ دونوں امام ہیں ، چاہے کھڑے ہوں ، چاہئے بیٹھے ہوں ۔ یہ سمجھ میں اُس وقت نہ آ سکتا کیونکہ یہ تو انسان کے حالات ہیں ، کبھی جاگتا ہے ، کبھی سوتا ہے ، کبھی اُٹھتا ہے ، کبھی بیٹھتا ہے ۔ اس کا امامت سے کیا تعلق ہے ؟ مگر جب مستقبل نے حالات کے رُخ سے پردہ اُٹھایا اور اب وہ اس وقت کا مستقبل میرے لئے ماضی بن گیا تو سمجھ میں آیا کہ پیغمبرؐ خدا اللہ کے دیئے ہوئے علم میں سے ماضی کے پردہ پر مستقبل کا نقشہ دیکھ رہے تھے ۔ پیغمبرؐ کا مقصد یہ تھا کہ میرے ان دونوں بچوں کا طرزِ عمل نگاہِ ظاہر میں متضاد ہوگا ۔ ایک صلح کرکے بیٹھ جائے گا ، ایک تلوار لے کر کھڑا ہو جائے گا ۔ کچھ لوگ اس کی صلح پر معترض ہوں گے ، کچھ لوگ اس کی جنگ پر معترض ہوں گے ۔ اس لئے پیغمبرؐ نے پہلے سے کہہ دیا کہ یہ میرے دونوں بیٹے امام ہیں ، چاہے کھڑے ہوں ، چاہے بیٹھے ہوں ۔

یعنی حسینؑ تلوار لے کر کھڑا ہو جائے تو اعتراض نہ کرنا اور حسنؑ صلح کر کے بیٹھ جائے تو اعتراض نہ کرنا ۔ وہ اُٹھنا بھی حکمِ خدا سے ہے اور یہ بیٹھنا بھی حکمِ خدا سے ہے ۔ وہ بھی امامت کا ایک انداز ہے اور یہ بھی امامت کا ایک شیوہ ہے ۔

پھر ایک سند خصوصی چھوٹے کو عطا فرمائی :

”حُسَیْنٌ مِنِّیْ وَاَنَا مِنَ الْحُسَیْنِ ۔“

''حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔''

یہ خاص حضرت امام حسین علیہ السلام کیلئے ہے۔ صحاحِ ستہ میں ہے، ترمذی بھی صحاح میں ہے، اس کی حدیث ہے کہ حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔ اگر دوسرا جملہ نہ ہوتا تو پہلا بالکل صاف تھا کہ حسینؑ مجھ سے ہے، وہ نانا ہیں، یہ نواسے ہیں۔ نانا کا وجود اسباب میں سے ہوتا ہے، نواسے کے وجود کیلئے۔

یہ بالکل سمجھ میں آنے والی بات ہے لیکن اب دوسرا جملہ کہ میں حسینؑ سے ہوں۔ پیغمبرؐ خدا کے کلام کی ایک خصوصیت ہے کہ

''أُوتِيتُ جَوَامِعَ الْكَلِمُ''۔

یعنی مختصر مختصر جملے ہوتے ہیں اور اس میں کتنے ہی پہلو ہوتے ہیں۔ اکثر جملے تو ایسے ہیں کہ جتنے اوصافِ کمال ہے پیغمبرؐ کے، ایک جملے سے وہ سب ظاہر ہو جاتے ہیں۔ یہ کلام رسولؐ کی خصوصیت ہے۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔

ان دونوں جملوں میں آخر ربط کیا ہے؟ پہلے میں کچھ اور ہو اور دوسرے میں کچھ اور ہو تو وہ ایسے ہے جیسے شعر دولخت ہوتا ہے۔ ویسے بے جوڑ فقرے ہو جائیں گے۔ لہٰذا ضرورت اس کی ہے کہ دونوں میں کوئی مناسبت ہو۔ اس وقت جو پہلو عرض کرنا ہے، وہ یہ ہے کہ ایک ہوتا ہے شے کا وجود اور ایک ہوتی ہے شے کی بقا۔ پہلا جملہ جو ہے کہ حسینؑ مجھ سے ہے، وہ وجود کے لحاظ سے ہے، دوسرا جملہ جو ہے وہ بقا کے لحاظ سے ہے۔ یعنی حسینؑ کا وجود

میرے وجود سے ہے اور میری بقا حسینؑ کی وجہ سے ہے۔

اب میں اُردو میں ایک جملے میں ترجمہ کرسکتا ہوں کہ حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں یعنی اگر میں نہ ہوتا تو حسینؑ نہ ہوتا اور اگر حسینؑ نہ ہوتا تو میں نہ رہتا۔

مصائب

جس وقت سے حسینؑ پیدا ہوئے، 3 /شعبان 3 ہجری سے لے کر 10 /محرم 61 ہجری تک حسین علیہ السلام رسولؐ سے اور 10 /محرم 61 ہجری سے لے کر قیامت تک رسولؐ حسینؑ سے۔ یہ حقیقت ہے کہ ایک انسان کی بقاء اس کے نام اور کام کی بقا سے ہے۔60ء ہجری میں رسول کا نام خطرہ میں تھا اور کام بھی خطرہ میں تھا، تو اب جس نے اپنی قربانی دے کر رسولؐ کے نام اور کام کو باقی رکھا، وہ رسولؐ کی بقا کا سبب ہے۔ یہی تو اتنا بڑا مقصد ہے جس کیلئے اتنی قربانیاں پیش کی گئیں۔ ایک روز کہہ چکا ہوں کہ استدلال کے دو طریقے ہیں: ایک طریقہ یہ ہے کہ سبب کو دیکھو، اثر کو دیکھو۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اثر کو دیکھو، سبب کو دیکھو۔

یہ دو طریقے ہیں، یہاں بھی دونوں طریقے دیکھ سکتے ہیں۔ پہلے سمجھ لیجئے کہ مقصد کتنا عظیم تھا، اس کیلئے بڑے غور وفکر کی ضرورت ہے، بڑے مطالعہ کی ضرورت ہے۔ اور میں دوسرا طریقہ آپ کو بتاتا ہوں کہ یہ دیکھئے کہ قربانیاں کیسی پیش ہوئیں اور ان قربانیوں کو دیکھ کر فیصلہ کیجئے کہ کیا یہ قربانیاں کسی معمولی

مقصد کی خاطر دی جاسکتی ہیں؟ وہ مقصد کتنا عظیم ہوگا جس کیلئے یہ قربانیاں پیش کی گئیں! علی اکبر کی جوانی ایسی نہ تھی کہ کسی معمولی مقصد کی خاطر دے دی جائے۔ عباس کا شباب ایسا نہ تھا کہ کسی معمولی مقصد کی خاطر دے دیا جائے۔ چھ مہینے کی جان وہ بچہ ایسا نہ تھا کہ کسی معمولی مقصد کی خاطر اس کی قربانی دے دی جائے۔

اور اربابِ عزا! آخر میں کہوں گا کہ زینب کی چادر ایسی نہ تھی کہ کسی معمولی مقصد کی خاطر دے دی جائے۔ اب میں آپ کو اس چادر کی اہمیت بتاؤں کہ مولا نے ہر قربانی اپنی نگاہوں کے سامنے پیش کی۔ وہ ہر لاشہ آنکھوں سے دیکھ سکتے تھے مگر یہ چادر زینب کی قربانی مولاؑ اپنی نگاہوں کے سامنے گوارہ نہیں کر سکتے تھے۔ اب ایک اور موقعہ عرض کروں گا بڑا دلدوز، کربلا کی تربیت یہ تھی کہ غیر اہم اشرف پر قربان ہورہا تھا۔ اصحاب جب تک زندہ رہے، عزیزوں کی باری نہیں، اعزہ میں جب تک ایک بھی رہا، اشرف کو کوئی گزند نہیں پہنچا۔ سب امام پر قربان ہوگئے اور درمیان کی مسافت چھوڑ کر خطابت نہیں کرنا چاہتا، میں کہتا ہوں کہ اب اگر کوئی چیز ایسی ہو کہ حسینؑ جس کیلئے خود کو خطرہ میں ڈال دیں تو اس کی اہمیت محسوس کرنا پڑے گی کہ مولاؑ کی نظر میں اس کی اہمیت کیا ہے؟ اب ایک نازک مرحلہ ہے، مصائب کی منزل وہ ہے کہ راکب دوشِ رسول اب زمین پر ہے۔

عالم یہ ہے کہ فوج میں اختلاف ہے کہ روح نے جسم سے مفارقت کی یا ابھی زندہ ہیں۔ ان میں سے ایک شقی نے یہ کہا، وہ بڑا اشقی تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دشمن مزاجِ حسینؑ سے واقف تھا۔ اُس نے کہا کہ میں ایک ترکیب بتاتا ہوں، گھوڑوں کی باگیں خیموں کی طرف موڑ دو۔ اگر زندہ ہیں تو برداشت نہیں کرسکیں گے۔

ہاں اربابِ عزا! یہ ہوگیا، گھوڑوں کا رخ خیام کی طرف کردیا گیا۔ مولاؑ کے کانوں میں جو آواز گھوڑوں کی ٹاپوں کی اپنے سے دور ہوتی ہوئی نظر آئی اور خیموں کے رُخ کی طرف سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں آئیں، جو کچھ میں نے عرض کیا تھا، اُس کے پیش نظر اس جملے پر غور کیجئے، دیکھئے خطرہ مولاؑ سے دور ہورہا ہے مگر مولاؑ نے جونہی دیکھا کہ گھوڑوں کا رُخ خیموں کی طرف ہے، کہنیوں پر زور دے کر کہا: ابھی میں زندہ ہوں، ابھی میرے خیموں سے کیا مطلب؟۔ ماشاءاللہ، مجلس ہوگئی ہے۔

مگر مجھے یاد ہے کہ آج کی مجلس میں سیدالساجدین علیہ السلام کے مصائب کا کچھ تذکرہ ہونا چاہئے۔ میں کہتا ہوں کہ اب دیکھئے کہ یہ عظیم امتحان کس نے دیا ہے؟ یہ ہمارے چوتھے امامؑ ہیں، یہ امتحان اُن کیلئے مخصوص ہوگیا اور یہ عظیم امتحان کس کا تھا اور کتنا عظیم امتحان تھا کہ پھوپھی سرہانے کھڑی ہیں: بیٹا! بتاؤ، خیموں میں چاروں طرف آگ لگی ہوئی ہے، تم بتاؤ جل کر مرجائیں یا باہر نکلیں؟ میں کہتا ہوں کہ تیروخنجر، نیزہ وتلوار جتنے حربے ہیں، وہ سب بڑے مصائب ہیں، مگر ان مصائب کی نوعیت کو دیکھئے، چند جملوں سے زیادہ عرض نہیں کروں گا۔ یہ دیکھئے کہ مولاؑ کو بحیثیت امامؑ پہلا حکم کیا دینا پڑتا ہے؟ یہ جانشین کے طور پر پہلا حکم دے رہے ہیں کہ پھوپھی! اب خیموں سے نکل جایئے ہاں اربابِ عزا! اب وہ بیبیاں، جن کی والدہ کا جنازہ رات کو اُٹھا تھا، وہ روزِ روشن میں اس طرح نکلتی ہیں کہ اُن کے سر کے بال کھلے ہوئے ہیں۔